آدھے چاند کی رات
کشمیری لال ذاکر
ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی
آدھے چاند کی رات
کشمیری لال ذاکر
EPH

آدھے چاند کی رات

آدھے چاند کی رات

کشمیری لال ذاکرؔ

ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی

AADHE CHAND KI RAAT

(NOVEL)

BY

KASHMIRI LAL ZAKIR

1992

Price Rs. 75/-

ISBN 81 - 85360 - 77 - 4

سن اشاعت	۱۹۹۲ء
قیمت	۷۵/- روپے
کتابت	شفیق الرحمٰن
سرورق کی تصویر	[زینہ کدل میں شاہ ہمدان کی زیارت گاہ اور اس کے ساتھ کالی دیوی کا مندر۔]
مطبع	چودھری پرنٹرس رودگران، دہلی ۶

ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس

۳۱۰۸ گلی عزیزالدین وکیل، کوچہ پنڈت لال کنواں دہلی ۱۱۰۰۰۶

TELEPHONE : 526162
774956

اِنتساب

نواب جعفر علی خاں اثر لکھنوی	بلراج بھسین	موہن یاور	ویراں بالی
خواجہ غلام السیدین	عبدالسمیع پال اثر صہبائی	سورج سنت	شانتا شرما
پروفیسر سدھیشور ورما	قیس شیروانی	بریگیڈیر اودھے چند بخشی	ہربنس لال گپتا
پروفیسر سیوا رام سوری	آذر عسکری	رام سرن	کرشن موہن
پروفیسر آر سی پنڈتا	ہری سنگھ ہردیش	سکھدیو سنگھ بالی	دینا ناتھ سرمست
پروفیسر ایس ایل پنڈتا	حکیم رحمت اللہ	ترلوکی ناتھ	مجبور کاشمیری
پروفیسر گردھاری لال گپتا	قدرت اللہ شہاب	جگدیش گیند	سرلا دتہ
پروفیسر مختار	کشن سمیل پوری	دھنی رام شرما	پران ناگپال
پروفیسر بی کے بوس	وشوامتر مہے	ہزاری لال وج	اندر ساہنی
پروفیسر شنکر لال	پدمنی مہے	غلام رسول نازکی	سبھارت بھوشن
پروفیسر پنا لال	سوم ناتھ صراف	سردار سریندر سنگھ بالی	کل بھوشن
ڈاکٹر روشن لال	استاد شکتی	پرتھی راج بخشی	سنت ملہوترہ
ملکہ پکھراج	سرینواس مہتہ	اوم پرکاش منور	چوکیدار ریسٹ ہاؤس بھدرواہ
ملک راج صراف	سرسوتی داس ورما	پرکاش موہن	چوکیدار ریسٹ ہاؤس پتنی ٹاپ
دیوان رام ناتھ کپور	کامریڈ محمد شفیع	راجندر جوہر	چوکیدار ریسٹ ہاؤس سناسر
نرسنگھ داس نرگس	شیخ عبدالرحمان	پرتیم مکھن سنگھ	چوکیدار ریسٹ ہاؤس رام بن
دریا شنکر گردش	رام ناتھ شاستری	سمترا نندا	چوکیدار ریسٹ ہاؤس بانہال
بلدیو متر بجلی	جیا لال وسنت	شیاما سبھاٹیہ	تھانیدار پولیس تھانہ چنہینی
ہرنام داس سوسن	پنڈت موتی رام	تارا پوری	تھانیدار پولیس تھانہ بٹوت
بلراج پوری	اجودھیا ناتھ وید	شیلا موہن	تھانیدار پولیس تھانہ گند

اِن سب کے نام

جن کی رہنمائی، محبت، رفاقت اور ہمدردی نے مجھے اپنی جد و جہد میں بڑا حوصلہ دیا

بول کہ لب آزاد ہیں تیرے

سلمیٰ کی موت میری زندگی کا پہلا ایسا حادثہ تھا۔

اِس سے پہلے میں نے کسی کی موت نہیں دیکھی تھی۔ صبح سویرے اُس کے گھر والے اُسے سوِل اسپتال میں لے گئے تھے اور شام کو اُس کی لاش لیکر گھر لوٹ آئے تھے۔ میں بھی دن بھر وہیں رہا تھا اور شام کو سلمیٰ کے گھر والوں کے ساتھ ہی واپس آیا تھا۔ سلمیٰ کا گھر میرے گھر کے سامنے تھا، جولاہکے محلّے میں۔ اور جب میں اپنے کمرے کی کھڑکیاں کھولتا تھا تو سلمیٰ کے کمرے کی کھڑکیاں سامنے ہوتی تھیں اور وہ کھڑکیوں کے ساتھ لگی کھڑی ہوتی تھی۔ وہ اور میں اپنی اپنی کھڑکیوں کے ساتھ لگے ایک دوسرے کو خاموش دیکھتے رہتے تھے۔ بول نہیں سکتے تھے کیونکہ درمیان میں ایک چھوٹی سی گلی تھی، جس میں مکان تو چار ہی تھے، لیکن ایک دوسرے کی آواز سُنائی دے جاتی تھی۔ کئی دفعہ سلمیٰ کھڑکی کے ساتھ کھڑی اپنے لمبے لمبے بالوں میں کنگھی بھی کرتی رہتی اور مجھے دیکھتی بھی رہتی۔ اور پھر دالان سے ماں کے پکارنے پر، وہ کھڑکی کا پردہ گرا دیتی اور خاموشی سے کمرے سے باہر چلی جاتی۔

ایسا تقریباً ہر روز ہی ہوتا تھا۔

سلمیٰ کا مُردہ جسم دالان میں رکھا تھا اور محلّے کی عورتیں اور سلمیٰ کی سہیلیاں اُس کے اِرد گرد کھڑی رو رہی تھیں۔ بیچ بیچ میں سلمیٰ کی ماں کی اونچی چیخ ماحول کو چیرتی ہوئی سی، ہمارے مکان کی کھڑکیوں سے اندر داخل ہوتی اور تیر کی طرح میرے کلیجے میں اُتر جاتی تھی۔ میری ماں کچھ دیر سلمیٰ کے مُردہ جسم کے پاس کھڑی رہ کر اور اُس کی ماں کو دلاسہ دے کر گھر لوٹی تھی۔

"موت کے بعد بھی بڑی خوبصورت لگ رہی ہے وہ تو۔ مجھے لگا جیسے ابھی اُٹھ کر

مجھے سلام کرے گی اور کہے گی — موسی جی میں ابھی آتی ہوں۔ چائے آپ کے ساتھ پیوں گی۔
اُس کی تو شادی بھی طے ہو رہی تھی سیالکوٹ میں" ماں اپنی گیلی آنکھیں پونچھتے ہوئے غسل خانے کی طرف چلی گئی۔

مجھے علم تھا کہ سلمیٰ کی شادی طے ہو رہی تھی۔ کچھ روز پہلے ہی تو اُس نے اِس بات کا ذکر کیا تھا اور بہت زور سے روئی بھی تھی۔

"تم آیا کرو گے سیالکوٹ مجھ سے ملنے؟" اُس نے پوچھا تھا۔

"تم پہلے وہاں جاؤ تو سہی۔"

"تمہیں شک ہے کیا؟"

"ہاں۔"

"کیوں؟"

"اس لئے کہ میرے ساتھ دوستی رکھنے والا شخص اپنی منزلیں بدلتا رہتا ہے۔"

پھر وہ زور سے ہنسی تھی اور بولی تھی۔

"تو میری منزل بھی بدل جائے گی؟"

"ہو سکتا ہے۔"

"میں تو بہت خوش ہوں گی اگر میری منزل بدل جائے۔"

اور اب کس انداز سے سلمیٰ نے اپنی منزل بدلی تھی، قیامت ہی تو ڈھائی تھی ظالم نے۔

سلمیٰ جو سارے محلّے کی جان ہوا کرتی تھی اور آنگن آنگن جس کے قہقہے گونجا کرتے تھے، اب قبرستان میں خاموش پڑی تھی۔ سارے محلّے کے ہندو اور مسلمان، دریائے توی کے کنارے کی اونچی سنگلاخ سطح پر واقع قبرستان میں صفیں باندھے کھڑے تھے۔ کچھ خاموش تھے، کچھ رو رہے تھے اور کچھ اپنے اپنے لواحقین کی قبروں کو دیکھکر انہیں یاد کر رہے تھے۔

اور پھر سلمیٰ کو قبر میں اُتار دیا گیا اور سب نے ایک ایک مٹھی بھر بھری مٹی، اسکی قبر پر ڈال دی۔ میں نے مٹی کی ایک مٹھی قبر پر ڈالی اور ایک مٹھی اپنے رومال میں باندھکر جیب میں رکھ لی۔ میں نے قبرستان کی مٹی کیوں اس طرح محفوظ کر لی تھی، اس وقت

مجھے اس کا کوئی دھیان نہیں آیا تھا۔ سنبھال کر رکھ لی تھی بس۔

پھر سب لوگ قبروں کو دیکھتے ہوئے، دھیرے دھیرے قبرستان سے باہر نکل کر ڈھکی چڑھنے لگے اور سلمیٰ کو ماضی کا ایک کردار سمجھ کر اپنے اپنے گھروں کو لوٹ گئے۔ میں بھی قبرستان کے شکستہ گیٹ سے باہر نکلا لیکن ڈھکی کی طرف نہیں مڑا۔ قبرستان کے باہر دائیں ہاتھ کو مڑ گیا اور تھوڑی دور جا کر کھڑا ہو گیا۔ میں دوسروں کی طرح سلمیٰ کو ماضی کے حوالے نہیں کر سکا تھا۔

نیچے ڈھلان میں، بہت دوری پر، توی کا دریا اپنے وسیع پاٹ کو بے حد سمیٹ کر خاموشی سے بہے جا رہا تھا۔ کئی لوگ کناروں پر کھڑے تھے۔ یہ وہ لوگ تھے جو شام کو اپنے اپنے گھروں سے آ کر توی کے ٹھنڈے پانی میں نہاتے تھے اور جاتی دفعہ ڈھکی پر بہت پرانے کنوئیں کے ٹھنڈے پانی سے صراحیاں بھر کر ساتھ لے جاتے تھے۔ یہ لوگ کتنے اچھے تھے، بڑے معصوم اور سادہ تھے۔ زندگی سے مطمئن تھے۔ انہوں نے زندگی سے ضرورت سے زیادہ امیدیں وابستہ نہیں کی تھیں، اس لیے انہیں مایوسیوں کا سامنا نہیں کرنا پڑا تھا۔ ان کے پاس اتنا وقت تھا کہ وہ اپنے اپنے گھروں سے تین چار میل کا فاصلہ طے کر کے توی کی ریت میں پاؤں دھنساتے، اُس کے ٹھنڈے پانی میں گھنٹوں کھڑے رہتے اور واپسی پر ڈھکی کے پرانے کنوئیں سے، پینے کے لیے ٹھنڈا اور صحت بخش پانی بھی لے جاتے تھے۔ اور پھر رات کو اپنی اپنی چھتوں پر لیٹے ڈُھڈُو (رات کو چلنے والی ٹھنڈی ہوا) کا آنند لیتے ہوئے صبح تک گھوک سوتے تھے۔

ان دنوں میرے ذہن پر بھگتی کا بہت تیز نشہ تھا۔ بعد میں تو وہ نشہ جب اُترا تو خُمار بھی نہیں چھوڑا کم بخت نے۔ ایکدم کڑواہٹ اور تلخی چھوڑ گیا۔ اُن دنوں میں صبح سویرے کمنڈل میں کچی لسی ڈال کر، جولاہکے محلے سے ننگے پاؤں پریڈ گراؤنڈ کے سامنے والے رنبیر ایشور مندر جاتا تھا۔ شِوجی اور پاروتی کی بڑی ہی سندر مورتیوں پر پھول اور بیل پتی چڑھاتا تھا اور بہت بڑے شِولنگ پر کچی لسّی ڈالتا تھا اور پھر اُس کی پریکرما کرتا تھا۔ یہ مندر بہت برس پہلے مہاراجہ رنبیر سنگھ نے بنوایا تھا۔ ایک طوفانی رات میں، اس مندر پر بجلی گری تھی۔ جو شِولنگ میں ایک بہت بڑی دراڑ چھوڑ گئی تھی۔ اس دراڑ کا ایک طویل نشان شِولنگ پر اب بھی موجود تھا۔ اور میں ہر صبح اس دراڑ کے نشان کو ایک بار

ضرور چھوتا تھا۔ شاید اسی لیے مجھے دراڑوں سے بڑی اُنسیت ہے۔ دراڑیں مجھے سدا ہی کسی نہ کسی حادثے کی یاد دلاتی ہیں اور میں حادثوں کو انسانی زندگی میں بڑی اہمیت دیتا ہوں۔ انسان کا دنیا میں آنا بذاتِ خود بھی تو ایک بہت بڑا حادثہ ہے۔

اُن دنوں میں ہر اتوار کو توی کو پار کر کے، باہُو کے قلعے میں استھاپت مہا کالی کے درشن کو بھی جاتا تھا اور ایک آدھ بار میں نے دیوی پر چھلاّ (بکری کا بچہ) بھی چڑھایا تھا۔ بڑی استُتی کیا کرتا تھا میں، مہا کالی کی اُن دنوں۔ رام کِشن جوتشی جو حکمت بھی کرتا تھا اور ہندو سبھا کا لیڈر بھی تھا میرا دوست تھا۔ وہ بھی مہا کالی کا بڑا اُپاسک تھا۔ اس نے مجھے ایک بار یہ بتایا تھا کہ مہا کالی میری اِشٹ دیوی تھی اور وہ ہمیشہ میری رکھشا کرتی تھی۔ اس لیے میں اُس کی آرادھنا ضرور کیا کروں۔ اُن دنوں میں واقعی مہا کالی کو بہت مانتا تھا۔

میں جب کبھی توی پار کر کے، باہُو کے قلعے کی طرف جاتا تھا، میری نظریں ہمیشہ بائیں طرف کی پہاڑی پر بنے ایک سفید رنگ کے چھوٹے سے مندر کی طرف اُٹھ جاتی تھیں۔ وہ مہا مایا کا مندر تھا۔ اور بہت پُرانا تھا۔ میں نے کئی بار سوچا کہ کسی اتوار کو، باہُو کے قلعے میں مہا کالی کے درشنوں کے بعد، مہا مایا کے مندر کو بھی دیکھنے جاؤں لیکن جا نہیں سکا۔ ایک تو یہ کہ باہُو کے قلعے میں اِتنی دیر ہو جاتی تھی کہ بھُوکے پیٹ کہیں اور جانے کی ہمت نہ ہوتی تھی۔ اور میں مہا کالی کی پُوجا کے لیے خالی پیٹ ہی تو جایا کرتا تھا۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ باہُو کے قلعے کی پہاڑی سے اُتر کر، راستے میں ایک بہت بڑا نالہ پڑتا تھا اور اس کے بعد پھر دوسری پہاڑی پر چڑھ کر، کوئی تین میل کا فاصلہ طے کرنا ہوتا تھا۔ مہا مایا کے مندر تک جانے کے لیے درمیان میں بہت گھنا جنگل تھا۔ راستہ بھی بڑا اُوبڑ کھابڑ تھا اور کانٹے دار جھاڑیوں سے اٹا پڑا تھا اور اکثر سنسان ہوتا تھا۔ اس لئے مہا مایا کے مندر تک نہ پہونچ سکا۔ صرف توی کو پار کرتے ہوئے اسے دیکھتا ہی رہا۔

ایک بار جب میں باہُو کے قلعہ میں گیا، تو مہا کالی کے مندر کے پُجاری نے کہا کہ مجھے مہا مایا کے مندر ضرور جانا چاہیے، کیونکہ اس دن وہاں ایک بہت بڑا بھنڈارا تھا اور ایک بہت ہی پہونچے ہوئے مہاتما وہاں آئے ہوئے تھے۔ پُجاری کی بات

سُن کر اور بھی تین چار آدمی مہا مایا کے مندر جانے کے لیے تیار ہو گئے۔ بس میں بھی ان کے سنگ ہو لیا۔ دُھوپ بھی تیز تھی، راستہ بھی کٹھن تھا۔ لیکن ساتھ اچھا تھا اس لیے ہم سب تھکے ہارے وہاں پہونچ ہی گئے۔ یہ ایک بہت ہی چھوٹا سا مندر تھا جس کے اندر مہا مایا کی مورتی استھاپت تھی۔ بڑے ہی پُر جلال چہرے والا ایک بزرگ سادھو وہاں موجود تھا جو امرناتھ کی یاترا سے لوٹا تھا۔ اس بھنڈارے کا انتظام اسی کے شردھالوؤں نے کیا تھا جو ادھم پور کے رہنے والے تھے اور اسی کے ساتھ آئے تھے۔

مندر کے اندر جا کر ماتھا ٹیکا اور پھر باہر آکر پہاڑی کی ایک طرف کھڑے نیچے بہتے ہوئے دریا اور سامنے پہاڑی پر بسے جموں شہر کو دیکھتا رہا، جسے صدیوں پہلے مہاراجہ جامبولوچن نے بسایا تھا۔ وہ بڑا سا پتھر جسے وہ توی سے اپنے کندھے پر اٹھا کر لایا تھا، آج بھی محلّہ کالی جنیٌ میں موجود ہے اور لوگ ہر منگل وار کو اس کی پوجا کرتے ہیں۔ اسی پتھر کے نام سے محلّے کا نام بھی کالی جنیٌ پڑا تھا اور اسی محلّے میں بہت برسوں تک جموں کے راجاؤں کے محل بھی رہے تھے۔ بہت بعد میں وہ یہاں سے راجہ کی منڈی میں منتقل ہوئے تھے۔ اُس پہاڑی پر کھڑے ہو کر میں اُس قبرستان کو بھی دیکھتا رہا، جہاں سلمیٰ کی قبر تھی اور جہاں میں اکثر جایا کرتا تھا اور جب موتیئے کے پھولوں کا موسم ہوتا تھا تو اس کی قبر پر موتیئے کے پھول چڑھا کر آیا کرتا تھا۔ سلمیٰ کو موتیئے کے پھول بہت پسند تھے۔ اور اس نے اپنے گھر کے آنگن میں موتیئے کا ایک بہت بڑا پودا لگا رکھا تھا، جس میں ڈھیروں کلیاں کھِلتی تھیں۔ اور ان کی خوشبو سلمیٰ کے گھر سے نکل کر میرے گھر میں بھی آیا کرتی تھی اور اس خوشبو میں پیار کی سُگندھ ہوا کرتی تھی، جو سلمیٰ اور میری محبت کی گواہی دیتی تھی اور پھر ہر لمحہ ہم دونوں کو ایک دوسرے کی قربت کا احساس دلاتی رہتی تھی۔

میں سب سے الگ تھلگ کھڑا بہت دیر سلمیٰ کے لیے روتا رہا۔

اچانک میرے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا تھا کسی نے۔ میں نے پلٹ کر دیکھا یہ تو وہی مہاتما تھے۔

"بھنڈارا تو سماپت ہونے والا ہے بیٹا۔ کچھ کھا لو۔"

"جی اچھا"

"بہت چنتا ہے تمہارے من میں؟"

"ہے مہاراج"

"جس کے لیے چنتا کر رہے ہو وہ تو ان سیماؤں سے مُکت ہو چکی ہے۔ اُسے کچھ معلوم نہیں۔"

"آپ کو کیسے پتہ ہے مہاراج؟"

"بس ہے۔ موہ مایا کو چھوڑ دو۔"

میری آنکھیں پھر چھلک پڑیں

"میری تو دنیا ہی اُجڑ گئی ہے، مہاتما جی۔"

"نگر اور گاؤں اور سنسار ایسے ہی اُجڑتے ہیں۔ جس پہاڑی پر تم اِس سمے کھڑے ہو، شتابدیوں پہلے یہاں ایک وشال نگر تھا۔ راجا کے اسیم موہ کے کارن اُجڑ گیا ایک دن۔ اسی لیے موہ کو اوشیہ ہی تیاگنا چاہیئے۔ سنو گے اِس نگر کی کہانی؟"

"جی مہاراج۔"

"تو بھنڈارا سماپت ہونے پر سناؤں گا۔"

مہا مایا دیوی کے بھنڈارے کے ختم ہونے کے بعد مہاتما نے جو کہانی سنائی وہ اس طرح سے ہے ——

جس پہاڑی پر مہا مایا کا مندر ہے اور جہاں اب بہت ہی گھنا جنگل ہے، وہاں کوئی دو ہزار سال پہلے، بہت بڑا شہر آباد تھا، جس کا نام دھارا نگری تھا۔ یہ شہر باہُو کے قلعے کے بالکل سامنے تھا۔ یہ شہر ایک بہت ہولناک زلزلے کے بعد ایکدم کھنڈر بن گیا تھا۔ یہاں کے راجہ کا نام وِکرما جیت تھا، اور مہاتما کے کہنے کے مطابق، مہاکوی کالی داس دھارا نگری ہی کا رہنے والا تھا۔ وِکرما جیت کے زمانے میں اس شہر کی بہت شہرت تھی۔ وِکرما جیت کی موت کے بعد اس کا بیٹا گدی پر بیٹھا، جو نہایت کمزور اور عیاش تھا۔ دھارا نگری کا شہر دھیرے دھیرے اپنی خوشحالی کھونے لگا۔ یہاں تک کہ رعایا کے وہ لوگ، جو وِکرما جیت کے بڑے وفادار تھے، اس کے بیٹے کے رویئے اور سلوک سے پریشان ہو کر شہر کو چھوڑنے لگے۔ وِکرما جیت کے زمانے کا مُکھیہ منتری اس کے بیٹے کا

بھی مُکھیہ منتری تھا۔ لیکن حقیقت یہ تھی کہ راجہ اُس سے کبھی رائے نہیں لیتا تھا۔ اور نہ ہی اُس کی کوئی بات مانتا تھا۔ مُکھیہ منتری نے جب یہ دیکھا کہ شہر کے اچھے اچھے لوگ، شہر چھوڑنے لگے تھے۔ تو اُس نے راجہ کو سمجھانے کی کوشش کی۔ عیاش راجہ نے اُسے اپنی توہین سمجھا اور مُکھیہ منتری کو اپنی سلطنت سے نکل جانے کا حُکم دیدیا۔ مُکھیہ منتری نے ایک بار پھر اپنی بات دوہرائی اور کہا کہ اگر راجہ نے اپنا رویّہ نہ بدلا تو دھارانگری نشٹ ہوجائے گی۔ یہ سُنکر راجہ کو طیش آگیا اور اُس نے اپنے مُکھیہ منتری کو قتل کردینے کا حُکم دیا اور اُس کی اکلوتی بیٹی کو زبردستی اپنے محل میں ڈال لیا۔ کہتے ہیں کہ مُکھیہ منتری کے قتل کے بعد آدھی رات کو بڑا بھیانک بھونچال آیا اور تمام شہر برباد ہوگیا۔ سوائے مہامایا کے مندر کے کچھ بھی نہیں بچا۔ دھارانگری کے اُجڑے ہوئے شہر کے کھنڈر رفتہ رفتہ ایک گھنے جنگل میں بدل گئے اور اُس جنگل کے درمیان صرف مہامایا کا مندر، دھارانگری شہر کی گواہی دیتا رہا۔ اور کچھ بھی نہیں بچا تھا اِتنے بڑے شہر کا۔

کوئی ایک ہزار سال بعد مہاراجہ رنبیر سنگھ ریاست جموں وکشمیر کی گدّی پر بیٹھا۔ وہ بڑا دھرم کرم والا آدمی تھا اور دھرم استھانوں کو بہت مانتا تھا۔ کہتے ہیں کہ ایک بار مہاراجہ رنبیر سنگھ بہت سخت بیمار ہوگیا۔ ہر طرح کا علاج کیا گیا لیکن دِن بدِن اُس کی حالت بگڑتی گئی۔ ایک رات خواب میں اُسے مہامایا دیوی نظر آئی اور اُس نے مہاراجہ سے کہا کہ وہ اُس کے کھنڈر بنے مندر کی ضرور مرمت کرائے۔ مندر کی مرمت کے بعد وہ بالکل تندرست ہوجائے گا۔ مہاراجہ نے مندر کو ازسرِنو تعمیر کرانا شروع کردیا اور اُس کی بیماری دِھیرے دِھیرے کم ہونے لگی۔ مندر کی مرمت ختم ہوتے ہی مہاراجہ بالکل تندرست ہوگیا۔ نوراتروں کے دن آئے تو مہاراجہ اپنے شاہی خاندان کے ساتھ مہامایا کے مندر میں حاضر ہوا۔ وہاں اُس نے ایک بڑا بھنڈارا کیا اور کنواری کنیاؤں کے پاؤں دھوکر اُن کی پُوجا کی۔ بس اُس دن سے اُس مندر کی مانتا بڑھنے لگی اور لوگ دُور دُور سے آکر منتیں ماننے لگے۔

کہانی سُنانے کے بعد مہاتما نے کہا۔

"تم بھی اپنے لیے کوئی منت مان لو۔ تمہارے ماتھے کو دیکھکر لگتا ہے، تمہیں

جیون میں بڑا کَشٹ ملے گا۔"

"کَشٹ اپ کَشٹ تو وِدھی کے ہاتھ میں ہے۔ میں کیا منّت مانوں مہاراج؟"

"تمہاری اپنی اِچھا ہے۔"

میں نے مہاتما سے بحث نہیں کی۔ بس خاموشی سے ایک منّت مان لی۔ مہاتما نے مجھے ایک رُدراکش دیا جو میں نے کئی برسوں کے بعد، مہامایا کے مندر میں جا کر پُجاری کو سونپ دیا تھا۔ کیونکہ اب میرے دماغ سے بھگتی کا نشہ اُترنے لگا تھا۔ اور میں دِھیرے دِھیرے ناستِک ہوتا جا رہا تھا۔ اُس دن قبرستان کی وہ مُٹھی بھر مٹّی، جو میں نے بہت برس پہلے اپنے رومال میں باندھ کر محفوظ کی تھی، اُسے بھی مہامایا کے چرنوں میں ڈال آیا تھا، سلمیٰ کی یادوں کے ساتھ موہ تیاگ دیا تھا میں نے۔ موہ سے گویا مُکتی پالی تھی۔

آنے والے برسوں میں میرا ذہن مجھے دھارانگری کے بارے میں مزید واقفیت حاصل کرنے کے لیے اُکساتا رہا اور پھر ایک دن مجھے جمّوں کی رنبیر لائبریری میں مہاراجہ رنبیر سنگھ کے دربار کے ایک عالم نورالدّین کی سوانح حیات مل گئی، جس میں اُس نے دھارانگری کے بارے میں بڑے اہم انکشافات کئے تھے۔ دھارانگری کا شہر ایک بھیانک زلزلے کی زد میں آکر رات کی رات میں برباد ہو گیا تھا۔ اس بات کا بھی نورالدّین کی سوانح حیات میں ذکر تھا۔ لیکن اُس سے اِس بات کی تصدیق نہیں ہوتی تھی کہ مہاکوی کالی داس دھارانگری کا رہنے والا تھا۔ امرناتھ کی یاترا سے لوٹے مہاتما کا تاریخ کا گیان شاید کم تھا۔

امرناتھ کی یاترا سے لوٹ کر بھنڈارا کرنے والے مہاتما سے دھارانگری کی کہانی سننے کے بعد، جب میں ایکدم اکیلا، گھنے جنگل میں اُوبڑ کھابڑ راستے پر چل رہا تھا اور سُورج بھی میری طرح، دن کا سفر طے کر کے اپنی آرام گاہ کی طرف لوٹ رہا تھا، تو میں نے اپنے آپ میں یہ فیصلہ کیا کہ ایک دن میں اپنے اس شہر کی کہانی لکھوں گا، جسے صدیوں پہلے راجہ جامبو لوچن نے بسایا تھا اور جس کے عین سامنے توی کے دوسرے کنارے پر، راجہ وِکرماجیت نے دھارانگری کے خوبصورت شہر کی بُنیاد رکھی تھی جو برسوں بعد رات کی رات میں کھنڈر ہو گیا تھا۔ اور پھر میں راجہ جامبو لوچن کے اس شہر کی کہانی کو مہاراجہ گلاب سنگھ کی خرید کی ہوئی کشمیر کی حسین وادی سے جوڑوں گا، جہاں جا کر

عوام میں کام کرنے کی بات میں اُن دنوں سوچتا رہتا تھا۔ کیونکہ میرے کئی اور دوست بھی ایسا ہی سوچ رہے تھے۔ اور فیوڈل اِزم کے خلاف لڑنے کا ارادہ کر رہے تھے۔

بہت برس لگ گئے مجھے اس کہانی کو لکھنے میں۔ اِتنے برس نہیں لگنے چاہیئے تھے۔ لیکن ایک بات یہ بھی ہے، اگر یہ کہانی میں اس سے پہلے لکھتا تو وہ یقیناً مختلف ہوتی۔ کیونکہ اس وقت کے حالات مختلف ہوتے۔ جو حالات وقت اور تاریخ نے ہم پر اب عیاں کئے ہیں، وہ پہلے کہاں موجود تھے؟ تو پھر میری وہ بات بھی تو ایک دم مختلف ہوتی، جو میں نے اِس کہانی میں بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔ حالات کے ساتھ ساتھ کہانی بھی تو بدلتی رہتی ہے اور اُس کو کہنے کا انداز بھی تو بدلتا رہتا ہے۔

اگر میں ناول کے صفحات میں، الفاظ کی مدد سے، اپنی بات پوری طرح سے نہیں کہہ سکا تو آپ میرے ہونٹوں کو حرکت کرتے ہوئے دیکھتے جائیے۔ میں اپنی بات اب بھی کہے جا رہا ہوں اور آئندہ بھی کہتا رہوں گا، جب تک کہ جسم و زبان کی وہ کیفیت رہے گی، جس کا اظہار فیض احمد فیضؔ نے اپنی نظم "بول" کے ان مصرعوں میں کیا ہے۔

بول، کہ لَب آزاد ہیں تیرے
بول، زباں اب تک تیری ہے
بول، کہ سچ زندہ ہے اب تک
بول، جو کچھ کہنا ہے کہہ لے

کشمیری لال ذاکرؔ
۸ رجنوری ۱۹۹۲ء

۲۶۷، سیکٹر ۴۴، اے
چنڈی گڑھ

۱

وہ رمضان ہانجی کی بیٹی تھی۔ اس کا نام زُون تھا۔ زُون کشمیری زبان میں چاند کو کہتے ہیں۔
حبہ خاتون کو بھی تو زُونی کہہ کر پکارا جاتا تھا کیونکہ وہ چاند کی طرح خوبصورت تھی اور اُس کی شاعری پُورنیما کی چاندنی کی طرح نرمل، پوِتر اور زندگی بخش تھی اور چاندنی کی طرح ہی اس کی شاعری کی خوشبو کشمیر کی حسین وادی میں چاروں طرف پھیلی ہوئی تھی۔ اسی خوشبو میں شرابور ہوکر تو شہزادہ یوسف شاہ چک اس کی تلاش میں سرگرداں اس حسین وادی میں پہنچا تھا۔
یہ اُن دنوں کی بات ہے جب حالات کا سُورج میری زندگی کے آسمان میں نصف النّہار پر تھا اور اس کی تمازت سے سارا ماحول سُلگ رہا تھا۔ گھر والوں سے میرا جھگڑا ہو گیا تھا، اس لیے کہ انھیں میری سیاسی سرگرمیاں پسند نہیں تھیں۔ میرے والد ڈوگرہ سرکار کی اعلیٰ ملازمت میں تھے اور میں ڈوگرہ فیوڈلزم کے خلاف بولتا بھی تھا اور لکھتا بھی تھا۔ سوال کئی قسم کے سمجھوتے کرنے کا تھا، جس کے لیے میں کسی قیمت پر تیار نہیں تھا۔ اور انہی دنوں میری سیاسی سرگرمیوں کی وجہ سے ایک لڑکی جس کا نام رشیل ڈوگرہ تھا، میرے کونٹیکٹ میں آئی تھی۔ وہ ایک بڑے اونچے گھر کی اکیلی اور تعلیم یافتہ لڑکی تھی۔ اُس کے گھر میں پردہ اس انتہا کا تھا کہ اُس کی ماں مردوں سے ملتی ہی نہیں تھی۔ اگر ملتی بھی تھی تو اپنے آپ کو ایک بڑی سی سفید چادر میں اس طرح ڈھک کر کہ دیکھنے والے کو صرف اس کی آنکھیں ہی نظر آتی تھیں، جو اتنی خوبصورت تھیں کہ ملنے والا اپنی مرضی کے مطابق ٹھیک انداز سے گفتگو بھی نہیں کر سکتا تھا۔ میں نے ایک بار رشیل ڈوگرہ سے کہا بھی تھا۔
"سُنا ہے تمہاری ماں کے سامنے کسی کو بولنے کی بھی ہمت نہیں ہوتی۔"
"مگر یہ بات صرف مَردوں تک ہی محدُود ہے۔ گھگھی بندھ جاتی ہے بے چاروں کی میری ماں سے بات کرتے ہوتے۔" رشیل نے بڑے زور سے قہقہہ لگایا تھا اپنی بات کہنے کے بعد۔
"مان لو میں شادی کا پروپوزل لے کر تمہاری ماں کے پاس جاؤں تو ـــــ"
اس نے میری بات درمیان میں ہی کاٹ دی اور کہا۔

"اس کی نوبت نہیں آتے گی۔"

"کیوں؟"

"اس لیے کہ وہ پروپوزل میرے لیول پر ہی ریجیکٹ ہو جاتے گا۔"

"اگر تمہارے لیول پر منظور ہو گیا تو؟"

"تو پھر آگے کے لیول پر کٹ جاتے گا۔"

"آگے کے لیول سے تمہاری مُراد کیا ہے؟"

"میری ماں کا دربار، جہاں ہر کسی فریادی کی رسائی ممکن نہیں۔"

رشیل اتنی زور سے ہنسی تھی اور اس کے گورے گورے گالوں پر، اس شدّت کی ہنسی سے، لہو کی سُرخی اتنی گہری ہو گئی تھی کہ میں ڈر گیا تھا۔

اتنا تو میں اس سمے بھی نہیں ڈرا تھا کبھی، جب میرے سخت گیر والد اپنی رعب دار آواز میں پوچھتے تھے، کہ سی۔آئی۔ڈی نے ایک جلسے میں کی گئی میری تقریر کی جو رپورٹ سرکار کو بھجوائی تھی وہ ٹھیک تھی یا غلط؟ اور میرے "ٹھیک" کہنے پر لہو کی ایسی ہی سُرخی کے ڈورے میرے والد کی آنکھوں میں لہرا جاتے تھے اور میں ان کی تاب نہ لا کر کمرے سے باہر نکل آیا کرتا تھا۔ لیکن لہو کی سُرخی کے ان لال لال ڈوروں کو رشیل کے گورے گالوں پر لہراتے ہوئے دیکھ کر میں ڈر تو ضرور گیا تھا لیکن کمرے سے باہر نہیں بھاگ سکا تھا۔ کیونکہ میری اور رشیل کی یہ گفت گو ایک بند کمرے میں نہیں ہو رہی تھی، بلکہ دریائے توی کے اُس بہت پُرانے پُل پر کھڑے، توی کے سُرخ سُرخ پانی کو دیکھتے ہوئے ہو رہی تھی، جس نے اپنے اندر جانے کتنی بھُر بھُری چٹانوں کی سُرخ مٹّی جذب کر لی تھی اور اپنے کناروں سے دُور بسے کتنے ہی گاؤں کو ڈبو دیا تھا۔ اب اس پُل کو توڑ کر نیا پُل بنا دیا گیا ہے اور اب توی کے پانی کو کئی جگہوں پر کاٹ کر، اس کی طغیانی کی شدّت کو کم کر دیا گیا ہے۔ اب دریائے توی کا پانی برسات کے دنوں میں اتنے گاؤں کو غرق نہیں کر سکتا، جتنے کہ وہ ان دنوں کیا کرتا تھا، جن دنوں کی بات میں کر رہا ہوں اور یہ بات بہت دن پُرانی ہے۔ شاید یہی کارن ہو گا میرے اس ذہنی ردِعمل کا، جو میری شخصیت کا حصہ بن چکا ہے کہ جب میرے سامنے کوئی مسئلہ اُٹھ کھڑا ہوتا ہے یا کوئی چیلنج آ جاتا ہے تو میں ڈر کر بھاگتا نہیں اس کا پوری ہمت سے مقابلہ کرتا ہوں، بِنا ہار جیت کا خیال کیے۔

لیکن رشیل کی ماں کے دربار میں پیش ہونے کا چیلنج بڑا ہمّت آزما تھا۔ شاید میں اس بہت بڑی حویلی میں، بہت وسیع کمرے کے عین درمیان، اکیلا کھڑا اس چیلنج کا سامنا

نہ کرسکتا اور ہار جاتا۔

لیکن شیل ڈوگرہ بڑی باہمت لڑکی تھی۔ وہ بھی اپنے لیول پر ایک جنگ لڑ رہی تھی اور اس جنگ میں کسی دوسرے کو شریک کرنا نہیں چاہتی تھی۔ وہ اپنی جنگ اکیلے ہی لڑے گی۔ ہارے گی تو میدان سے لوٹ کر نہیں آئے گی، وہیں کھیت ہو جائے گی' جیتے گی تو باہو کے قلعے کی کالی دیوی کے سامنے جھک کر اس کا احسان مانے گی اور پرشاد لے کر، فتح کے جھنڈے کو لپیٹ کر اس کے چرنوں میں ڈال دے گی اور باہو کے پہاڑ کی ڈھلان سے اُتر کر واپس چلی جاتے گی۔ ڈوگرہ راجے ہر فتح کے بعد ایسے ہی تو کیا کرتے تھے۔ وہ تو خیر بکروں کی بلی بھی چڑھایا کرتے تھے۔ لیکن اُسے تو بلی چڑھانے میں آستھا نہیں تھی۔ جو تھوڑی بہت آستھا تھی بھی اُس میں، مجھ سے دوستی ہو جانے کے بعد وہ بھی ختم ہو گئی تھی۔

شیل نے اپنی جنگ اکیلے ہی لڑی اور جب جیت کر باہو پہاڑ سے اُتر کر میرے پاس آئی تو بڑی طرح ہانپ رہی تھی۔ اس کے گورے گالوں پر لہو کی سُرخی پہلے سے بھی زیادہ شدید ہو گئی تھی کیونکہ وہ دُھوپ میں چل کر آئی تھی اور بے حد تھکی اور ٹوٹی ہوئی تھی۔

اور پھر اس نے اپنا دُھوپ سے تپتا ہوا چہرہ میرے سینے سے لگا دیا تھا اور ایکدم پھپھک پڑی تھی۔

"اب تمہیں فریادی بن کر میری ماں کے دربار میں حاضر ہونے کی ضرورت نہیں۔" میں نے شیل کو اور زیادہ کس لیا تھا اپنی بانہوں میں۔

" مجھے معلوم ہے تم فریاد نہیں کر سکتے صرف جنگ کر سکتے ہو۔ میں نے تمہاری جنگ بھی لڑ لی ہے۔"

میں نے شیل کے پسینے سے بھیگے ہوتے بالوں پر اپنا چہرہ ٹکا دیا۔

"میں تم سے شادی کر رہی ہوں۔"

اور پھر شیل میرے بازوؤں سے کھسک کر فرش پر بے سُدھ گر پڑی اور میں دیر تک اس کے چہرے پر ٹھنڈے پانی کے چھینٹے مارتا رہا۔

دس دن کے بعد ہماری شادی ہو گئی۔

شادی پر بہت ہنگامہ ہوا۔ کچھ میرے گھر والوں کی طرف سے۔ کچھ شیل کے گھر والوں کی طرف سے۔ اس کے گھر والوں کی طرف سے تو ہنگامہ اتنا شدید تھا کہ وہ ہم دونوں کو مروا دینا

چاہتے تھے۔ رشیل ہی کی ایک دوست نے ہمیں پناہ دی اور ہم پانچ روز تک اکھنور کی ایک پرانی سی حویلی میں پڑے رہے۔ میں حویلی سے نکل کر چناب کے دریا تک کو دیکھنے نہیں جا سکا تھا، جو اُن دنوں پورے زوروں پر تھا اور رات بھر اُس کی شوکتی ہوئی لہروں کی آوازیں گھروں پر دستک دیتی رہتی تھیں۔ دریاؤں سے میرے عشق کی ایک الگ داستان ہے۔ میں نے طوفانوں کے کواڑوں پر خود بھی تو کتنی بار دستکیں دی ہیں۔

میرے دوستوں نے اپنی ماؤں کے زیور چرا کر اور اپنے باپوں کی جیبیں ٹٹول کر کافی رقم اکٹھی کر لی اور ہم دونوں کو ترغیب دی کہ اکھنور کی ایک پرانی اور سیلن کی ماری حویلی میں قید بھگتنے کے بجائے سرینگر چلے جائیں اور وہاں کسی ہاؤس بوٹ میں ٹھاٹھ سے رہیں۔ یہ ضروری تو نہیں کہ ہاؤس بوٹوں میں سمندر پار سے آئے ہوئے ٹورسٹ ہی رہ سکتے تھے اور ان کے مالکوں سے اور ملازموں سے ہتک آمیز سلوک کرنے کی جرأت کر سکتے تھے۔ چنانچہ رشیل اور میں، دوستوں کی چرائی ہوئی رقمیں اپنی جیبوں میں ڈال کر، سرینگر کے لیے روانہ ہو گئے۔ رشیل کے پاس وہ رقمیں تھیں جو اُس کی سہیلیوں نے چرا کر اس کے حوالے کی تھیں اور میری جیب میں میرے دوستوں کی چرائی ہوئی رقمیں تھیں۔

عشق کے دو چور، چوری کے مال پر عیش کرنے سرینگر پہنچ گئے تھے۔

ہمارے ایک پارٹی ورکر دوست بشیر احمد نے ہمیں رمضان جُو ہانجی کا ایک چھوٹا سا ہاؤس بوٹ کرائے پر لے دیا تھا۔ فیصلہ یہ ہوا تھا کہ جب ہمارا چوری کا مال ختم ہو جاتے تو ہم جموّں لوٹ آئیں، تب تک ہنگامے ٹھنڈے پڑ جائیں گے اور چناب کی شوکتی ہوئی لہریں رات کو دروازوں پر دستک دینا بھی چھوڑ چکی ہوں گی۔ رمضان جُو ہانجی کے ہاؤس بوٹ پر ہی ہماری ملاقات اس کی بیٹی ذُون سے ہوئی تھی۔ ذُون نو دس برس کی ایک نازک سی گوری چٹی، نہایت ہی خوبصورت لڑکی تھی۔ وہ ہر وقت مسکراتی رہتی تھی اور جب ذرا زور سے ہنستی تھی تو اس کے دونوں گورے گورے گلابی گالوں میں چھوٹے چھوٹے گڑھے پڑ جاتے تھے۔ گڑھوں کے کارن تو وہ اور بھی زیادہ خوبصورت لگنے لگتی تھی۔ ہانجیوں کی پروفیشنل ٹریننگ کے مطابق وہ لوگ اپنے کرایے داروں کو میم صاحب اور صاحب بہادر کہہ کر ہی مخاطب کرتے تھے۔ فرنگی کرایے دار خوش ہو کر انھیں بخشش بھی دے دیا کرتے تھے اور ان سے زیادہ کام بھی لیا کرتے تھے۔ ذُون کی ماں اکثر بیمار رہتی تھی اس لیے وہ ہاؤس بوٹ کے دھندے میں رمضان جُو کی بہت ہی کم مدد کرتی تھی۔ ذُون بس ایک طرح

سے رمضان جُو کی اسسٹینٹ تھی اور اپنی ذمہ داری بڑی خوش اسلوبی سے نبھاتی تھی۔
پہلے ہی دن ڈُون نے جس طرح سے ہماری دیکھ بھال کا کام، اپنے ذمہ لیا اُس سے رشیل اور میں دونوں بے حد متاثر ہوتے۔ اپنی عادت اور پروفیشنل ٹریننگ کے مطابق اس نے جب پہلی بار رشیل کو میم صاحب کہہ کر مخاطب کیا تو مجھے ہنسی آگئی۔ کہنا تو میں چاہتا تھا کہ وہ اسے میم صاحب کی جگہ "چورنی صاحب" کہے لیکن رشیل نے اسے خود ہی ٹوک دیا تھا۔

"میں میم نہیں ہوں ڈُون۔ میمیں تو ولایت میں ہوتی ہیں۔ میں تو اِسی ریاست کی رہنے والی ہوں۔"

"تو آپ کو کیا کہہ کر پکارا کروں؟"

"تم مجھے آپا کہا کرو۔ میں تو تمہاری بڑی بہن ہوں۔ تمہاری کوئی بڑی بہن ہے؟"

"جی نہیں۔"

"تو آج سے میں ہی تمہاری بڑی بہن ہوں۔"

یہ کہہ کر رشیل نے اُسے اپنے ساتھ چمٹا لیا اور ڈُون ایکدم کھلکھلا اُٹھی۔ اس کے دونوں گالوں پر دو چھوٹی چھوٹی جھیلیں اُبھر آئیں، جن میں معصوم تمناؤں کی مُرغابیاں تیر رہی تھیں اور اپنے گیلے پنکھوں کو پھڑپھڑا رہی تھیں۔

"اور آپ کو کیا کہہ کر پکارا کروں؟" ڈُون نے مجھے مخاطب کیا۔

"چور صاحب؟" میں نے جواب دیا۔

"اس بے چاری سے تو مذاق نہ کرو۔" رشیل نے ٹوک دیا۔

"آئی ایم سوری۔"

"مینشن ناٹ سر۔" ڈُون فٹ سے بول اُٹھی۔

رشیل اور میں دونوں زور سے ہنسنے لگے۔ فرنگیوں کے ساتھ ہاؤس بوٹ میں گفتگو کرنے سے ڈُون اتنی انگریزی تو سیکھ ہی گئی تھی۔ فرنگی ٹورِسٹ اکثر ان کے ہاؤس بوٹ کو کراتے پر لیتے رہتے تھے۔

"تمہارا کوئی بڑا بھائی ہے؟"

"نہیں جی۔"

"تو تم مجھے ہی اپنا بڑا بھائی مان لو اور مجھے بھائی صاحب کہہ کر ہی مخاطب کیا کرو۔"

"جی اچھا۔"

"تمہارے تو مزے ہو گئے ڈُون۔ بڑی بہن اور بڑا بھائی مفت میں مل گئے تمہیں۔"

"آپ کے بھی تو مزے ہیں۔" وہ بولی۔

"کیسے؟"

"ہم نے اپنی اتنی اچھی آپا بھی تو آپ کو دیدی ہے۔"

"اسے تو میں بھگا کر لایا ہوں۔"

"سچ!"

"ارے اِنھیں سوائے مذاق کے کچھ بھی تو نہیں آتا۔"

"پیار بھی تو آتا ہے۔"

"خاک آتا ہے۔" رشیل نے جواب دیا۔

"ڈُون کو جا لینے دو۔ پھر نپٹوں گا تم سے۔"

"آپ میری آپا سے جھگڑا کرو گے؟"

"ہاں۔"

"سب مرد اپنی بیویوں سے صرف جھگڑا ہی کرتے ہیں کیا؟"

"تمہارا ابا بھی جھگڑا کرتا ہے تمہاری ماں سے؟"

"بہت کرتا ہے۔ کبھی کبھی تو پیٹ بھی دیتا ہے اُسے۔"

"سچ ڈُون؟"

"ہاں آپا۔"

"آج گھر جا کر اپنی ماں سے کہہ دینا اب رمضان جو اُس سے کبھی جھگڑا نہیں کرے گا۔"

"کیوں؟"

"بس کہہ جو دیا۔ تم اپنی ماں سے کہہ دینا۔ میں نے ڈُون کو اپنی طرف کھینچتے ہوئے کہا۔"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے بھائی صاحب؟"

"ایسا ہی ہوگا ڈُونی۔"

"اگر جھگڑا نہیں ہوا اور میری اماں کو مار نہیں پڑی تو وہ مر جائے گی۔"

"مر کیسے جائے گی؟"

"وہ تو صرف مار کھانے کے لیے ہی زندہ ہے آپا۔ میری اماں کے ساتھ کی سبھی عورتیں صرف مار کھانے کے لیے ہی زندہ ہیں۔"

"تم ٹھیک کہہ رہی ہو ڈون۔ میری اپنی ماں کے زندہ رہنے کا بھی یہی راز ہے۔ ہمارے ملک کی زیادہ تر عورتوں کے لمبی عمر تک زندہ رہنے کا بس یہی ایک راز ہے۔ مار کھاؤ اور گھر والے کے پاؤں دباؤ۔ اسی کے پاؤں میں تمہاری جنّت ہے۔"

ہمارے کھانے اور سونے کا انتظام کرنے کے بعد رمضان جُو اور ڈون دونوں اپنے ڈونگے میں چلے گئے، جو نگین لیک میں کوئی زیادہ دُوری پر نہیں تھا۔ اور ایک موٹی سی رسّی کے ساتھ کنارے پر اُگے شہتوت کے ایک پیڑ سے بندھا تھا۔ شادی کے بعد وہ پہلی رات تھی جس میں ہمیں سکون اور اطمینان کا احساس ہوا تھا۔ ہم بہت دیر اپنے ماضی کے معمولی معمولی سے واقعات دوہراتے رہے جن میں ہم اور ہمارے کئی اور دوست بھی شریک تھے۔ ایک ایک کر کے اُن سب دوستوں کو یاد کرتے رہے، جنھوں نے ہمیں اس ہاؤس بوٹ میں کچھ دن رہ سکنے کی توفیق دلائی تھی۔ اور پھر بہت دیر تک ہاؤس بوٹ کے بیڈ روم کی کھڑکی کا پھولدار پردہ ہٹا کر، صاف نرمل آسمان میں چمکتے ہوئے چاند کو دیکھتے رہے، جس کا عکس جہلم کے پانی میں بھی تیر رہا تھا۔ لگتا تھا پورنماشی بس آنے والی تھی۔

یوں کھڑکی کے سامنے کھڑے، میرے کندھے پر ہاتھ رکھے شیل نے ایکدم رونا شروع کر دیا۔

"کیا ہو گیا اچانک شیل؟" میں نے اسے اپنی بانہوں میں لیتے ہوئے کہا۔

"ماں یاد آگئی۔ پورنماشی کا برت رکھے گی تو مجھے بہت یاد کرے گی۔"

"مجھے بھی تو یاد کرے گی۔"

"لیکن کسی اور کانٹیکٹ میں۔" اُس نے کہا اور پھر مُسکرانے کی کوشش کی۔

"مجھے جی بھر کے گالیاں دے رہے ہوں گے تمہارے ماں باپ۔ شاید پولس میں رپٹ بھی لکھوا چکے ہوں گے۔"

"ایسا نہیں کر سکتے۔ وہ عزّت دار لوگ ہیں۔"

"مجھ سے زیادہ عزت دار ہیں؟"

"ہاں، تمہاری کیا عزّت ہے؟ شہر کے ہر پولس تھانے میں تمہارے خلاف رپورٹیں درج ہیں۔"

رشیل کی بات سُن کر مجھے بڑا صدمہ ہوا۔ میں نے اپنی بانہوں کی گرفت ڈھیلی کر دی اور کھڑکی سے ہٹ کر، بستر پر لیٹ گیا۔ مجھے احساس ہوا کہ جاگیرداری کی جڑیں اگر کٹ بھی جائیں، جاگیردارانہ ذہنیت پھر بھی قائم رہتی ہے۔ رشیل اپنی ماں کا دربار تو چھوڑ آئی تھی لیکن درباری رعونت ابھی باقی تھی اُس میں۔

آسمان میں چمکتے ہوتے چاند کی ہلکی ہلکی روشنی کھڑکی سے داخل ہو کر میرے بستر کے ایک حصے پر بکھر رہی تھی۔ جوں جوں چاند اپنا سفر پورا کرتا رہے گا، کھڑکی سے اندر آتی ہوئی چاندنی بھی اپنا زاویہ بدلتی رہے گی۔ زندگی کے سفر میں انسان بھی شاید میل کے پتھروں کے ساتھ ساتھ اپنی سوچ کے زاویے تبدیل کرتا رہتا ہے۔ اپنے جاگیردار گھر والوں کے چھوڑنے کے تھوڑے ہی دن بعد رشیل کی سوچ کا انداز شاید بدلنے لگا تھا۔ بستر میں آنکھیں بند کر کے لیٹے ہوتے مجھے رُلائی آگئی۔ تبھی مجھے لگا رشیل کھڑکی سے ہٹ کر ہاؤس بوٹ کے فرش پر بیٹھ گئی تھی، جس پر خوبصورت رنگوں کے دھاگوں سے کڑھائی والا سفید سفید نمدہ بچھا تھا۔ اور اس نے آنسوؤں سے بھیگا ہوا چہرہ میرے پاؤں پر رکھ دیا تھا۔ میں چونک کر اُٹھا اور رشیل کو فرش سے اٹھا کر اپنے قریب بستر پر بٹھالیا۔

"رشیل میری بات دھیان سے سُنو۔"

رشیل نے کوئی جواب نہ دیا اور میرے کندھے سے لگ گئی۔

"ان آٹھ دنوں میں، جو ہم نے گھر سے بھاگ کر شادی کر لینے کے بعد چھُپ چھُپ کر گزارے ہیں، جس میں آج کی رات بھی شامل ہے، میں نے اپنے خاوند ہونے کے کسی ادھیکار کا استعمال نہیں کیا ہے۔ تم اُسی طرح پوِتر ہو جیسے سات دن پہلے تھی اور آج کی رات بھی ویسی ہی رہو گی۔"

میری بات سُن کر رشیل نے اپنا نم آلود چہرہ، میرے کندھے سے اُٹھالیا اور بولی۔

"کیا کہنا چاہتے ہو تم؟"

"یہ کہ تم واپس جموں چلی جاؤ اور اپنی ماں کے دربارِ خاص میں حاضر ہو جاؤ۔ تمہاری ماں تمہیں معاف کر دے گی۔"

"تم سمجھتے ہو کہ صرف مہاراجہ کے خلاف تقریریں کرنے اور اخباروں میں زہر اُگلنے سے ہی زندگی کے تقاضے پورے ہو جاتے ہیں؟"

"اب سوچتا ہوں کہ شاید نہیں ہوتے۔ چاندنی راتوں میں صرف اپنے جاگیردار ماں باپ کے لیے آنسو بہانے سے اور اپنی غلطیوں پر افسوس کرنے سے ہوتے ہیں۔"
"شٹ اپ یُو اِیڈیٹ۔" وہ چیخی اور بستر سے اُٹھ کر میرے سامنے کھڑی ہو گئی۔
"بس میں یہی چاہتا تھا۔ تمہارا اصلی روپ تو اب آیا ہے سامنے۔" میں نے بڑے سکون سے کہا۔
"دیکھ لیا نا اصلی روپ؟"
"ہاں۔ بہت سُندر ہے۔" میرے جواب میں کوئی کرختگی نہیں تھی۔
"تو میں کل صبح واپس چلی جاؤں گی۔"
"ٹھیک ہے۔"
اس کے بعد ہم دونوں اپنی آنکھیں ہاؤس بوٹ کی چھت پر گاڑے جاگتے رہے۔ دونوں خاموش تھے۔ دریا کے دونوں کناروں پر کھڑے تھے دو شخص اور کناروں کو جوڑنے والا کوئی پُل نہیں تھا۔ کچّی لکڑی کا جو عارضی پُل بنا تھا، دریا کی تُند لہریں اسے بہالے گئی تھیں۔ میں ابھی تک تلاش کر رہا تھا پُل کا ٹوٹا ہوا کوئی تختہ، جسے دریا پار کرنے کے لیے استعمال کیا جا سکتا ہو۔ شیل کیا تلاش کر رہی تھی، مجھے معلوم نہیں ـــ اور پھر آدھی رات کے بعد مجھے لگا کہ شیل تھک کر گہری نیند سو گئی تھی اور دریا کی لہریں دِھیرے دِھیرے لوٹتے ہوتے پُل کا ہر تختہ بہا کر لے جا رہی تھیں۔ صبح تک یہ سارے تختے وُلر جھیل کے پانی میں پہنچ جائیں گے۔ اگر کسی طرح وہ ڈل جھیل میں پہنچ جائیں تو لوگ اُن پر مٹی ڈال کر اپنے لیے تیرتے ہوتے کھیت تیار کر لیں گے، جنھیں وہ جب چاہیں کھینچ کر نئی نئی جگہوں پر لے جائیں گے۔
لیکن ہمارے سوچنے سے کیا ہوتا ہے؟
کچھ بھی تو نہیں ہوتا۔
گورو نانک نے بھی تو یہی کہا تھا:
سوچیں سوچ نہ ہووتیے، جے سوچیں لکھ وار
مگر ہم پھر بھی سوچتے رہتے ہیں۔ ہر گھڑی، ہر پل، ہر دن، ہر رات۔ سوچنا ہی شاید انسان کا مقدّر ہے۔

صبح سویرے ڈون آئی تھی چائے لیکر۔

"میں اندر آجاؤں ؟"

"آجاؤ ڈون ۔" میں نے جواب دیا۔ مجھے لگا جیسے میں رات بھر جاگتا ہی رہا تھا۔ ڈون نے اخروٹ کی لکڑی سے بنی ٹرے میں رکھا چائے کا سامان میرے بستر کے سامنے رکھی تپائی پر ٹکا دیا۔ میں نے دیکھا اس کی آنکھیں سُوجی ہوئی تھیں۔

"تمہاری آنکھیں تو سُوج رہی ہیں۔"

"کہاں سُوج رہی ہیں ؟" شیل ہڑبڑا کر اُٹھی تھی۔ اسے لگا تھا کہ یہ سوال میں نے اُس سے کیا تھا۔

میں نے اُس کی آنکھوں کو دیکھا۔ وہ واقعی سُوج رہی تھیں۔

"سُوج تو رہی ہیں۔" میں نے مسکرا کر کہا۔

"تم تو ویسے ہی کہتے رہتے ہو۔"

"آنکھیں تو آپ کی واقعی سُوج رہی ہیں آپا!" ڈون پیالوں میں چائے اُنڈیلتے ہوئے بولی۔

"سُوجن تو تمہاری آنکھوں میں بھی ہے۔"

ڈون جھینپ گئی اور اس نے پیالی میں چائے اُنڈیلنا چھوڑ دیا۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھ اپنی آنکھوں پر دھر لیے۔

"کیا ہوا ڈون ؟"

"وہی جو ہر رات ہوتا ہے۔ میرے ابا میری اماں کو بُری طرح مارتے ہیں اور میں الگ کھڑی روتی رہتی ہوں۔" اس کی آواز کپکپانے لگی تھی۔

"کل رات بھی پیٹا تھا اُس نے ؟" میں نے پوچھا۔

"بہت بُری طرح۔"

"بس آج کے بعد تمہارا ابا تمہاری اماں کو نہیں مارے گا۔" میں نے بڑے اعتماد بھرے لہجے میں کہا۔

"آپ نے تو کل بھی یہی بات کہی تھی، بھائی جان۔"
"لیکن کل رات میں نے بھی بہت مار کھائی تھی ڈُونی ڈیر۔"
"آپ نے ؟"
"ہاں۔"
"کس نے مارا تھا آپ کو ؟"
"تمہاری آپا نے۔"
"اسی لیے آپا کی آنکھیں سُوج رہی ہیں ؟"
"کبھی کبھی ظلم کرنے والا بھی روتا ہے ڈُونی۔ وہ پچھتاوے کے آنسو ہوتے ہیں اور جب وہ روتا ہے تو اُس کے آنسو نہیں رُکتے۔ اس کے آنسو چھم چھم گرتے رہتے ہیں اور اس کی آنکھیں سُوجتی رہتی ہیں۔"
"تمہارے بھائی جان ٹھیک ہی کہہ رہے ہیں۔" یہ کہتے ہوئے رشیل بستر سے اُٹھی اور اس نے ڈُونی کو اپنے ساتھ چمٹا لیا۔ رشیل کی سُوجی ہوئی آنکھوں کی سُرخی ڈُونی کی سُوجی ہوئی آنکھوں کی سُرخی میں تحلیل ہو رہی تھی۔

رشیل اور ڈُونی کے آنسوؤں میں کامن ڈی نامی نیٹر دونوں کی ماں تھی۔ سماج کی ایک بھرپور اکائی۔ جس کے کتنے روپ ہیں۔ وہ سرسوتی بھی ہے، چنڈی بھی ہے، سیتا بھی ہے، دروپدی بھی ہے۔ لیکن وہ ہر دَور میں ناانصافی اور جبر کا شکار ہوتی ہے۔ ایک طرف وہ ایک غریب ہانجی کی بیوی کی حیثیت سے مار کھاتی ہے تو دوسری طرف وہ رشیل کی ماں کی حیثیت سے اپنے دربار میں کسی فریادی کی رسائی نہیں ہونے دیتی۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ دونوں پہلو عورت کی فرسٹریشن اور گھٹن کے اظہار کے مختلف روپ ہیں۔ بے بسی اور مجبوری کا اظہار آنسوؤں سے بھی ہو سکتا ہے اور تشدد سے بھی۔

ڈُونی کی ماں تصویر کا ایک رُخ ہے۔
رشیل کی ماں تصویر کا دوسرا رُخ۔

ڈُونی کی آنکھوں کی سُوجن تصویر کا صرف ایک رُخ دیکھنے کا نتیجہ ہے اور رشیل کی آنکھیں اس لیے سُوجی ہیں کہ وہ میرے پہلو میں پڑی تمام رات تصویر کا دوسرا رُخ دیکھتی رہی ہے اور میں نے یہ سوچ کر ساری رات آنکھوں میں کاٹی ہے کہ وہ بڑے سکون اور آرام

سے سو رہی تھی۔

ہماری مجبوری یہ ہے کہ ہم ایک وقت میں تصویر کا صرف ایک ہی رُخ دیکھ سکتے ہیں۔ دوسرا رُخ ہماری آنکھوں سے اوجھل رہتا ہے۔ شاید اسی لیے کبھی کبھی ہمارے فیصلے بھی یک طرفہ ہوتے ہیں!

انسان کس قدر مجبور اور بے بس ہے!

میرے اللہ اسے کبھی خود مختار بھی تو کر!

اسے کبھی اپنے فیصلے خود بھی تو کرنے دے!

اپنے فیصلوں پر دستخط کرتے وقت اس کے قلم کو اپنی انگلیوں کی گرفت سے آزاد بھی تو کر کبھی!!

چائے پینے کے بعد میں نے ڈُون سے کہا۔

"ناشتہ کتنی دیر میں مل سکتا ہے ڈُونی ڈیر؟"

"آپ کو ناشتہ جلدی چاہیئے؟"

"ہاں۔"

"تو جلدی تیار ہو جائے گا، بھائی جان۔"

"بات یہ ہے کہ تمہاری آپا کو بس پکڑنی ہے۔"

"کہاں جانا ہے آپا کو؟"

"جموں۔"

"وہ کیوں؟"

"اسے اپنی ماں کی بہت یاد آ رہی ہے۔"

ڈُون کھلکھلا کر ہنس پڑی اور اس کے گالوں کی جھیلیں اور گہری ہو گئیں۔

"آپ سچ کہہ رہے ہیں؟"

"انھوں نے سچ کبھی بولا ہے جو اب بولیں گے۔ بس جھوٹ کی کمائی کھا رہے ہیں شروع سے۔" رشیل نے کہا۔ لیکن اس کے لہجے میں کسی قسم کی تلخی نہیں تھی۔

میں مسکرا دیا تو اس نے اپنی بات کی وضاحت دوسرے ڈھنگ سے کی۔

"جب ابھی ہفتہ بھر پہلے، شادی کے دن پنڈت، کے ہر شلوک پر سر ہلا کر 'ہاں'،

کہہ رہے تھے۔ اس وقت بھی جھوٹ ہی بول رہے تھے تمہارے لاڈلے بھائی جان"۔
"لیکن تمہاری آپا تو صبح سے لے کر رات تک سوائے سچ کے کچھ نہیں بولتیں۔ انھوں نے کل رات خود ہی تو کہا تھا کہ وہ صبح یہاں سے چلی جائیں گی"۔
"مگر یہ تو نہیں کہا تھا کہ جموں جاؤں گی"۔
"تمہارا کوئی اور بھی ٹھکانہ ہے، مجھے تو علم نہیں"۔
ڈون بے چاری ایکدم خاموش کھڑی تھی اور ہماری گفتگو اسے بالکل سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔
"میں تو جاؤں گی نشاط اور شالیمار باغ"۔
"کیا کرنے؟"
"خوبصورت پھولوں کو دیکھنے اور ڈل کی سیر کرنے"۔
"اکیلی جاؤ گی؟"
"نہیں۔ ڈون بھی میرے ساتھ جائے گی۔ چلو گی نا ڈون؟"
"ابا سے پوچھنا پڑے گا"۔
"وہ میں پوچھ لوں گی۔ تمہیں تو کوئی اعتراض نہیں؟"
"نہیں آپا"۔
ڈون کے چہرے سے لگتا تھا جیسے اسے کچھ بھی تو سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ شیل نے ہم دونوں کی لڑائی میں اس بے چاری کو خواہ مخواہ گھسیٹ لیا تھا۔ اس نے حیرت بھری نظروں سے میری طرف دیکھا اور بولی۔
"آپ نہیں جائیں گے ہمارے ساتھ؟"
"نہیں۔ میں نے نشاط اور شالیمار بہت بار دیکھ رکھے ہیں۔ تم دونوں ہی جاؤ"۔
"میں آپ کے بغیر نہیں جاؤں گی"۔
"کیوں نہیں جاؤ گی؟" شیل نے پوچھا۔
ڈون بڑی ذہنی کشمکش میں تھی۔ اس نے میری طرف دیکھا تو مجھے لگا کہ اُسے میری مدد کی ضرورت تھی۔
"اپنے بھائی جان کے بغیر کیسے جاسکتی ہے یہ؟" میں نے جواب دیا۔

"وہ خود نہیں بول سکتی کیا؟ تم اس کے وکیل ہو؟"

"ہاں۔ میں تو ہر اس شخص کی وکالت کرتا ہوں جو خود بول نہیں سکتا۔ اور خاموش رہنے کی وجہ سے اپنا مقدّمہ ہارتا رہتا ہے۔"

"تو بولئے وکیل صاحب عدالت سُن رہی ہے۔"

"ہم نے مقدّمہ جیت لیا ہے۔ اب وکیل صاحب نہیں بولیں گے۔"

میری بات سن کر، اب تک خاموش اور گُم وصُم کھڑی ڈُون نے کُھل کر قہقہہ لگایا اور اس کے گالوں کی گہری جھیلوں میں جذبات کی مُرغابیاں اپنے گیلے پنکھ پھڑپھڑانے لگیں۔ رشیل بھی مسکرادی۔

ان دونوں کی مسکراہٹ کی دھوپ میں نہایا ہوا ہماری زندگی کا ایک مشترکہ نازک لمحہ ایک کڑے موڑ سے صحیح سالم گزر گیا تھا۔ زندگی کے ان نازک نازک لمحوں کے یوں حفاظت سے گزر جانے سے ہی زندگی کی خوبصورتی اور عظمت قائم رہتی ہے۔

ڈُون نے بڑی پھُرتی سے ناشتہ تیار کر دیا اور رشیل اور میں جلدی سے نہا دھو کر تیار ہو گئے۔ رشیل نے جب اپنے شگفتہ اور شاداب ہونٹ میرے گالوں پر رکھ دیے اور میرے ہاتھ کو بڑی مضبوطی سے پکڑ کر اسے زور سے دبا دیا تو مجھے لگا جیسے میرے بدن میں تازہ خون دوڑنے لگا تھا۔ رات مجھے احساس ہوا تھا جیسے میرا جوان خون میری ناڑیوں میں جم سا گیا تھا اور اسے پگھل کر جسم کے مختلف حصوں میں پہنچنے کے لیے کسی تیز الاؤ کی تپش کی ضرورت تھی۔ میں نے جب رشیل کے جسم کو گھُما کر اسے اپنی باہوں میں لے لیا تو اُسی کھشن ٹرے میں ناشتہ سجاتے ڈُون اندر داخل ہوئی۔

"بڑی بے شرم ہو تم۔" میں نے رشیل کو اپنی باہوں سے الگ کرتے ہوتے کہا۔

"بے شرم تو آپ ہیں بھائی جان۔" ڈُون تپائی پر ناشتہ رکھ کر بھاگنے لگی۔

"ٹھہر، ابھی پٹائی کرتا ہوں تیری۔"

ڈُون بڑی پھُرتی سے باہر نکل گئی۔

رمضان جُو نے بخوشی ڈُون کو ہمارے ساتھ جانے کی اجازت دیدی۔ بلکہ اُسے ہمیں ٹھیک طرح سے گھُمانے پھرانے کے لیے ضروری ہدایتیں بھی دیں۔ پھر یہ بھی کہا کہ سیر سے لوٹنے کے بعد ہم لوگ اس کے ڈونگے میں ہی چائے پیئں گے۔ اس نے ہمیں سبز نمکین

چائے کے ساتھ تازہ کلیجے کھلانے کا بھی وعدہ کیا۔ میری دلچسپی تو رمضان جُو کی بیوی سے ملنے میں تھی۔ میں یہ جاننا چاہتا تھا کہ اس بدنصیب عورت میں کیا بُرائی تھی جس کی وجہ سے اس کا خاوند اُسے ہر رات مارتا تھا اور وہ کیوں اب مار کھانے کی اتنی عادی ہو چکی تھی کہ اس کے بغیر زندہ نہ رہ سکتی تھی۔ کیا مار کھانا بھی ایک نشہ ہے جس کی ایک بار عادت پڑ جاتے تو پھر وہ چھوٹتا نہیں، بلکہ وقت کے ساتھ ساتھ یہ عادت اور پکّی ہوتی جاتی ہے اور جب تک جسم ساتھ دیتا ہے عورت کو مار کھانے میں مزہ آتا ہے۔ اور بھی تو کتنی بے ہودہ اور سماج دشمن ایسی عادتیں ہیں جن کے ہزاروں لوگ شکار ہیں۔ لیکن ان سے چھٹکارا نہیں حاصل کر سکتے۔ مسلسل مار کھاتے رہنا بھی تو ایسی ہی ایک عادت ہے شاید

رمضان جُو نے ہمارے لیے ایک بڑھیا سے شکارے کا انتظام کروایا۔ شکارے کا نام "شہزادہ" تھا۔ سیٹوں پر بہت موٹے موٹے رنگدار گدے رکھے تھے۔ دھوپ سے بچنے کے لیے شکارے کے اوپر بڑی پیاری سی، کئی رنگوں والی، چھت ڈلی ہوئی تھی۔ شکارے کا ماجھی ایک خوبصورت نوجوان تھا۔ اس کا نام مبارک تھا۔

"مبارک، یہ لوگ میرے خاص مہمان ہیں، ان کا خیال رکھنا اور انھیں جی بھر کر ڈل کی سیر کرانا۔ ڈُون بھی ان کے ساتھ ہے۔" رمضان جُو نے ہدایت کی تھی۔

"ٹھیک ہے رمضان چاچا۔"

"کوئی شکایت نہ ہونی چاہیئے ان کو۔"

"کوئی شکایت نہیں ہوگی اطمینان رکھو۔"

جب تک مبارک چپو کی مدد سے شکارے کو کنارے سے دھکیل کر پانی میں نہیں لایا، رمضان جُو کنارے پر ہی کھڑا رہا۔ پھر مبارک چپّو چلاتا رہا اور رمضان کنارے پر کھڑا ہاتھ ہلاتا رہا۔ ڈُون بھی اس کی مدد کر رہی تھی۔

میں اس سے پہلے بھی تو ڈل کی سیر کر چکا تھا۔ تیرتے ہوتے کھیتوں اور پانی میں کھلے کنول کے بہت بڑے بڑے پھولوں کی خوبصورتی کا لطف بھی تو اُٹھا چکا تھا۔ لیکن جانے کیوں مجھے ایسا لگ رہا تھا کہ آج میں پہلی بار ایک اچھے شکارے میں بیٹھا تھا۔ پہلی بار میں نے سامنے کے پہاڑ دیکھے تھے۔ پہلی ہی بار میں نے تیرتے ہوتے کھیتوں پر اُگی ہوئی سبزیاں دیکھی تھیں اور پہلی ہی دفعہ میں نے ڈل کے پانی میں کنول کے پیارے پیارے، بڑے بڑے گلابی پھولوں

کو دیکھا تھا، جن کے پتّوں پر پانی کی بوندیں اب بھی دھوپ میں موتیوں کی طرح چمک رہی تھیں۔ میں نے محسوس کیا کہ یہ سب جو مجھے اتنا نیا، اتنا پیارا اور اتنا خوبصورت لگ رہا تھا صرف رشیل کے ساتھ ہونے کے کارن تھا۔

"مجھے تو آج یہ سارا منظر، یہ پہاڑ، کناروں پر لگے سفیدے کے درخت، ڈل کے پانی میں چار چناروں کا یہ ٹاپو، سب کچھ ایکدم نیا اور خوبصورت لگ رہا ہے۔"

"مجھے بھی تو سب کچھ نیا نیا ہی لگ رہا ہے۔ کتنی سندرتا اور کتنا انوکھا پن ہے واتاورن میں۔"

شکارا ڈل کے عین درمیان میں تھا اب۔ ڈون مبارک کے پاس سے اُٹھ کر پھر ہمارے قریب آگئی تھی۔

"یہ واتاورن کیا ہوتا ہے آپا؟" ڈون نے سوال کیا۔

"ماحول۔" میں نے جواب دیا۔ "زبان، دیکھا کیسا مسئلہ کھڑا کر دیتی ہے۔" میں نے ہنس کر کہا۔

"آج تو ماحول بہت خوبصورت لگ رہا ہے، بھائی جان۔"

"کیوں ہُوا ہے ایسا؟"

"کیونکہ میں کئی مہینوں کے بعد رنگین سے نکل کر ادھر آئی ہوں۔" ڈون نے مسکراتے ہوتے جواب دیا۔

"یہ سب خوبصورتی تمہارے آنے سے نکھری ہے نا؟"

"جی۔" ڈون نے ہنستے ہوتے جواب دیا۔

"ایک بات کہوں رشیل؟"

"کہو نا۔"

"کنول کے پھول اس لیے تازہ اور خوبصورت لگتے ہیں کہ وہ پانی میں رہتے ہیں۔ پانی اور ہوا اور دھوپ میں رہنے والے لوگ بھی تو سدا تر و تازہ اور شاداب اور خوبصورت رہتے ہیں۔ پانی کا کتنا بڑا اثر ہے پھولوں پر اور انسانوں پر۔"

"اِسی لیے تو ڈون اتنی خوبصورت ہے۔"

رشیل کی بات سُن کر ڈون شرما گئی اور اس کے گالوں پر بھی کنول کے پھولوں کا گلابی پن اُبھر آیا۔

حالانکہ وہ خود لمحہ بھر پہلے اِس بات کا اظہار کر چکی تھی۔

"شرما کیوں رہی ہو ڈوُنی ؟ تمہاری آپا نے تو بالکل ٹھیک ہی بات کہی ہے۔"

اُسی لمحہ تین شکاروں کی ایک ٹولی ' ایک دوسرے کے پیچھے تیز رفتاری سے ہمارے شکارے کے پاس سے گزر گئی۔

شکاروں میں بیٹھے ٹوُرِسٹس نے زور زور سے تالیاں بجا کر اپنی جیت کا اعلان کیا ہم تینوں بھی ان کی فتح میں شریک ہو گئے اور ہم نے بھی تالیاں بجانا شروع کر دیں۔

" میں اور تیز چلاؤں، صاحب ؟" مبارک نے پوچھا۔

" نہیں مبارک، ہم یہاں مقابلہ کرنے نہیں آتے۔ لطف اُٹھانے آتے ہیں۔ زندگی کا لطف اٹھانا بہت کم لوگ جانتے ہیں۔"

"ہارنے میں بھی ایک مزہ ہوتا ہے، مبارک۔" رشیل نے کہا۔

"یہ بات تم کہہ رہی ہو ؟"

" ہاں، ہارنے کا ایک علیحدہ ہی لُطف ہوتا ہے۔ اس کا شاید تمہیں اندازہ نہیں۔"

" مجھے اندازہ نہیں اس کا، رشیل ؟ یہ بات وہ کہہ رہی ہے جس کے ہاتھوں میں کئی کئی بار ہارتا رہا ہوں۔"

"کون کس سے ہارتا ہے اور کیوں ہارتا ہے۔ یہ بہت کٹھن سوال ہے۔ اس کا جواب دینے والا خود بھی کئی بار ہار چکا ہوتا ہے شاید۔"

ڈوُن کچھ دیر ہمارے پاس بیٹھ کر دوبارہ مبارک کے پاس چلی گئی تھی۔ وہ پانی میں دھیرے دھیرے چپو چلا رہی تھی۔ وہ دونوں چپو بھی چلا رہے تھے اور آپس میں باتیں بھی کر رہے تھے۔ ان دونوں کو شاید ایک دوسرے کا ساتھ پسند تھا۔ اُوپر گہرا نیلا آسمان تھا، جس میں کہیں کہیں بادلوں کے ٹکڑے تیر رہے تھے۔ کبھی کبھی تیز دھوپ شکارے کی پھولدار موٹی چادر کے اندر سے گزر کر، ان موٹے موٹے گدوں پر بھی پڑ جاتی تھی، جس کے ساتھ رشیل اور میں پیٹھ لگائے خاموش بیٹھے تھے اور بیچ بیچ میں ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر مسکرا دیتے تھے۔ دائیں طرف بُلوارڈ روڈ کے کناروں پر لگے سفیدے کے لمبے اونچے درخت بڑے خوبصورت لگ رہے تھے اور دائیں ہاتھ کے پہاڑوں کا طویل سلسلہ ماحول کے پُراسرار بانکپن میں اور بھی اضافہ کر رہا تھا۔ اِنھیں پہاڑوں کے دامن میں چشمہٴ شاہی کا ٹھنڈا، میٹھا اور زندگی بخش جھرنا

بہہ رہا تھا۔ نشاط اور شالیمار باغ کے رنگ برنگے پھول اور چناروں کے بڑے بڑے پرانے درخت (جن کے تنوں پر ابھی تک مغلیہ خاندان کی پرچھائیاں مرتسم تھیں) اپنی بہاریں لٹا رہے تھے اور کچھ ہی دُوری پر ہارون جھیل اُس پانی سے بھری پڑی تھی، جو اونچے اونچے پہاڑوں کی ڈھلانوں سے بہہ کر، جھیل میں جمع تھا اور وادی میں رہنے والے لوگوں کو پینے کا پانی مہیّا تا تھا۔

شکارا اپنی مخصوص رفتار سے ڈل کے پانی میں تیرتا ہوا سا آگے ہی آگے بڑھتا جا رہا تھا اور میں خاموشی سے، اپنے آپ میں ڈوبا ہوا سا، کشمیر کی وادی کی تاریخ دُہراتے جا رہا تھا جو میں نے کچھ عرصہ پہلے، بہت دن لگا کر کلہن کی آٹھ ترنگوں پر مشتمل بھاری بھرکم کتاب 'راج ترنگنی' کے صفحوں میں پڑھی تھی۔ راج ترنگنی کا ارتھ ہے بادشاہوں کا دریا۔ کتاب کی آٹھ ترنگیں یا لہریں بادشاہوں کے مختلف ادوار کو تقسیم کرنے کا انداز ہے، جو کلہن نے اس تاریخ کو لکھنے کے لیے اپنایا۔ کلہن کا والد کنٹپک پنڈت راجہ کا بڑا قابل وزیر تھا اور اُسی کے کارن کلہن کو دربار میں جانے کے مواقع اکثر مہیا ہوتے تھے۔ وہ سنسکرت کا شاعر تھا اور اس نے 'راج ترنگنی' سنسکرت میں لکھی تھی، جس کے ترجمے بعد میں ہوتے رہے۔ 'راج ترنگنی' کے ایک حصے کا پہلا ترجمہ سلطان زین العابدین نے فارسی میں کروایا تھا اور اس کا نام 'بحرُ الاسمار' رکھا تھا۔

کلہن پنڈت نے 'راج ترنگنی' کو ۱۱۴۸ بعد مسیح میں لکھنا شروع کیا اور اسے ۱۱۵۰ بعد مسیح میں مکمل کر دیا۔ اُس نے اس کتاب میں ۲۳۳۲ سالوں کی کشمیر کی تاریخ کا احاطہ کیا ہے۔ کلہن پنڈت نے اس تاریخ کا آغاز ۱۱۸۴ قبل مسیح سے کیا ہے۔ اس سے پہلے کے ۱۲۶۶ سالوں میں قریب قریب ۲ ۵ راجاؤں نے کشمیر پر حکومت کی لیکن ان میں سے کسی کے بارے میں کسی قسم کا ریکارڈ موجود نہیں۔ چنانچہ کلہن نے راج ترنگنی کا آغاز راجہ گونا ندہ سوم سے کیا ہے جو ۱۱۸۴ قبل مسیح میں کشمیر پر حکمراں تھا۔

'راج ترنگنی' کے مطابق کسی زمانے میں سارا کشمیر ایک بہت بڑی جھیل ہوا کرتی تھی جس کا نام ستی سر تھا۔ اس میں جل اودنام کا ایک اُسر رہتا تھا اور چاروں طرف پھیلی ہوئی جھیل پر اس کی حکمرانی تھی۔ وہاں کے ناگ لوگ اس سے بے حد نالاں تھے۔ چنانچہ پرجاپتی کشیپ نے ان کی فریاد دیوتاؤں تک پہنچائی اور ان سے پرارتھنا کی کہ وہ جل اود اُسر کو مار کر ناگ لوگوں کی جان بچائیں۔ کہا جاتا ہے کہ دیوتاؤں نے اپنی شکتیاں استعمال کر کے، ستی سر جھیل کا

تمام پانی سُکھا دیا۔ اب جل اودُ اسر کے لیے اپنے آپ کو چھپانے کے لیے کوئی جگہ نہیں تھی۔ دیوتاؤں نے اس پر حملہ کر کے اسے مار دیا اور اور ناگ لوگ بڑے سکون سے رہنے لگے۔ اور ان کے سب سے بڑے راجہ نیل ناگ نے ان کی حفاظت کی ذمہ داری اپنے اُوپر لے لی۔

یہ تو پھر کئی صدیوں کے بعد راجہ پرورسین نے پانڈریتھن کے مقام پر سرینگر شہر کی بنیاد رکھی۔ پانڈریتھن سنسکرت لفظ پُرنا اوشٹھان کی بدلی ہوئی صورت ہے، جس کے معنی ہیں پُرانا شہر۔ پانڈریتھن کا مندر آج بھی سرینگر سے کچھ ہی میل دُور سرینگر جموں ہائی وے سے ذرا اندر کی جانب بائیں طرف نشیب میں ثابت وسالم موجود ہے۔ اگرچہ یہ مندر اب بادامی باغ کی فوجی چھاؤنی کا ہی ایک حصہ بن گیا ہے۔ جہاں فوجی جوان اکثر درشنوں کو آتے رہتے ہیں اور میرے سامنے پانڈریتھن کے قدیم مندر کی پرچھائیں تیر رہی تھی جسے میں نے دو سال پہلے دیکھا تھا۔ شکارا ڈل کے پانی پر رقص کرتا ہوا آگے بڑھا جا رہا تھا۔

سراسر پتھر کا بنا یہ مندر کشمیر میں فنِ تعمیر کا منفرد نمونہ ہے۔ سردل کی سطح کو نظر میں رکھیں تو یہ مندر ساڑھے سترہ فٹ مربع ہے اور بناوٹ کے اعتبار سے منڈپ قبیل کی تعمیرات کے زمرے میں آتا ہے۔ طرز تعمیر کی پرکھ سے پانڈریتھن کا مندر جدت کا احساس دلاتا ہے۔ تین تہوں والے سردلوں کے دونوں اُور چوکور پاتے نئی طرز تعمیر کے مظہر ہیں۔ تعمیر کی جدت اور دیواروں کا آڑے نہ آنے کے طفیل روشنی اور سائے کا ایک دِل پذیر منظر کُھلتا ہے۔ اس سے پہلے کی تعمیروں میں ایسی خصوصیات کی کمی و کوتاہی محسوس ہوتی ہے۔

نو سلوں پر مشتمل مندر کی اہرامی طرز کی چھت دو حصوں میں بٹی ہے۔ اوپر والی چھت اور نچلی والی چھت کے درمیان ایک پٹی ہے جس پر چاروں اور مورتیوں کی قطار بنی ہے۔ مورتیوں کی قطار کے اوپر اولتی اُبھاری گئی ہے۔ اوپر کی چھت میں چار طرف چار روشندان ہیں جو گاندھارا دور کے (یونانی) طرز تعمیر کے نشانات ہیں۔ مندر کے شمال، مشرق اور مغرب کی طرف سے دروازے ہیں اور جنوب کی اور کھڑکی۔ چاروں طرف سردلوں کے تکون ہیں مگر "لوکیش"، کی مورتی صرف شمالی دروازے والی سردل پر ہے۔ باقی تین طرف محض تکونے موجود ہیں۔ قیاس ہے کہ ان سردلوں پر کبھی مورتیاں رہی ہوں گی۔

مندر کے فرش پر سلیں بچھی ہیں اور پوجا کے کمرے کے وسط میں سات فٹ مربع نشیب

رہی ہے، جہاں مورتی وغیرہ کے لیے چبوترہ یا کبھی رہیٹھ رہا ہو گا۔ پُرانے وقت کی کوئی مورتی وہاں نظر نہیں آتی۔ مگر اب نشیبی حصّے کو بھر کے اس پر سیمنٹ کا ایک چوکور چبوترہ بنا یا گیا ہے چبوترے پر سیمنٹ کی ہی پرنالی ہے جس میں ایک چھوٹا شولنگ پیوست ہے۔

مندر کی دیواریں سادہ ہیں مگر اس کی اندرونی چھت کشمیر میں پتھروں پر مربع نقش گری کی ایک قابلِ دید مثال ہے اندرونی چھت کو تین ہم مرکز مربعوں میں بانٹا گیا ہے، جن میں سے اندرونی مربعے کا کونہ باہری مربعے کو ہر طرف سے نصف پر کاٹتا ہے۔ بیچ کے مربعے میں بارہ پنکھڑیوں والا کنول اُبھارا گیا ہے اور کنول کے اِرد گرد دانے دار چکر ہے۔ چکر اور مربعوں کے ذریعے اندرونی چھت میں چھوٹے بڑے بارہ تکون بنے ہیں۔ ہر بڑے تکون میں یکھشوں کی ایک جوڑی اور ہر چھوٹے تکون میں ایک یکھش کو اُبھارا گیا ہے۔ طرزِ تعمیر کے لحاظ سے مندر کی اندرونی چھت چینی ژانگ طرز سے میل کھاتی ہے۔ مندر کے پتھروں کے بنے چبوترے پر، چاروں طرف ایک سیدھ ہاتھیوں کی قطار بنی ہے۔

رشیل نے مجھے اپنے آپ میں اس بُری طرح ڈوبا ہوا دیکھ کر کہنی سے ہلایا اور کہا۔

"کیا سوچ رہے ہو؟"

"سوچ رہا ہوں کہ پانڈریتھن کی چھوٹی سی بستی کے زمانے سے لیکر جہلم کے کنارے پر شیر گڑھی میں تعمیر ہوتے ڈوگرہ راجاؤں کے پرشکوہ محلات کے زمانے تک، کشمیر کی وادی میں رہنے والا ایک عام آدمی آج بھی وہیں کھڑا ہے جہاں وہ راجہ پرورسین کے زمانے میں کھڑا تھا۔ وِتستا ندی اپنا نام بدل کر دریائے جہلم بن گئی۔ ویری ناگ، مارتنڈ، پٹن، ہری پربت، آونتی پورم کی تاریخی حیثیتیں تبدیل ہو گئیں۔ لالیشوری، حبّہ خاتون، نندرشی، شیخ نُورالدین ولی، بابا ریشی، حضرت، پیر دستگیر خانیار پر بڑے بڑے ریسرچ ہوتے اور ان کے بارے میں نئے نئے تاریخی انکشافات کیے گئے لیکن وادی میں رہنے والے عام آدمی پر کسی مورخ، کسی محقق، کسی ادیب یا صحافی نے کوئی کام نہیں کیا۔ وادی میں رہنے والے عوام پر ہر بیرونی اور اندرونی حکمران نے حکمرانی ضرور کی، انھیں اپنی شناخت نہیں دی۔ ہر کوئی اپنی ہی پہچان چاہتا ہے۔ تم نہیں چاہتیں اپنی ریکاگنیشن؟" میرے اچانک سوال پر، رشیل چونک پڑی۔

"ضرور چاہتی ہوں"

"اور جب تمھیں یہ ریکاگ نیشن نہیں ملتی ؟"

"تو بہت بُرا لگتا ہے۔ بڑی فرسٹریشن ہوتی ہے۔ من میں بغاوت کا جذبہ اُبھرتا ہے۔"

"بس یہی ہوا ہے کشمیری عوام کے ساتھ بھی۔ انھیں اپنی آئی ڈینٹیٹی نہیں ملی۔ وہ اتنی صدیوں سے اپنی شناخت کو ترس رہے ہیں۔"

"اور اب فرسٹریٹیڈ محسوس کر رہے ہیں۔"

"اور جب فرسٹریشن ایک خاص سٹیج پر آجاتی ہے تو پھر بغاوت کا جذبہ اُبھرنے لگتا ہے۔"

"اور ہم جیسے لوگ اس جذبے کو ہوا دینے کے لیے آجاتے ہیں۔"

"ہم نہ آئیں گے تو کوئی اور آجائے گا۔ اگر کوئی بھی نہیں آئے گا تو جانتی ہو پھر کیا ہوگا؟"

"نہیں۔"

"مبارک اور ذُودی اور ان کے ساتھ رمضان جُو اور شاید اس کی مجبور اور بے بس بیوی بھی نور سیٹھ کو اپنے خوبصورت شکاروں میں سیر کروانے سے انکار کر دیں گے۔ وہ اپنی محنت اتنے سستے داموں نہیں بیچیں گے۔ ڈل کا پانی اُبلتے ہوئے لاوے میں بدل جائے گا ــــ شالیمار اور نشاط کے پھول انگارے بن جائیں گے اور وادی میں ہر سمت اور ہر جگہ چھاؤں دینے والے چناروں کے پتّے آگ اُگلنے لگیں گے۔"

"کیا کہہ رہے ہو تم ؟"

"ٹھیک ہی کہہ رہا ہوں۔ وہ وقت اب دُور نہیں ہے۔ ہمیں چنیاؤ ذی کی آواز کو سُننا چاہیے۔ اپنے کان بند نہیں کرنے چاہئیں۔"

"مبارک اور ذُودن کیا سوچ رہے ہوں گے ہمارے بارے میں۔"

"ابھی وہ سوچ کی اُس منزل پر نہیں پہنچے۔ جس کا میں ذکر کر رہا ہوں۔ اس سے پہلے کہ وہ اس منزل پر پہنچیں ہمیں کچھ کر لینا چاہیے۔"

"ہم کر تو چکے ہی ہیں۔"

"کیا کیا ہے ہم نے ؟ گھر والوں کے ڈر سے چھپ کر شادی کر لی اور پھر خیرات کے پیسوں کو عیاشی میں اڑانے کے لئے چوری چھپے یہاں چلے آئے۔ ہم کتنے بزدل ہیں، کبھی سوچا ہے تم نے ؟ میں اپنے باپ کا مقابلہ نہیں کر سکا۔ تم اپنی ماں کا مقابلہ نہیں کر سکیں۔ بڑے ورد دیہی بنے پھرتے ہیں ہم۔ لعنت ہے ہم پر۔" مجھے لگا جیسے میں نے غصے میں بہت اونچی آواز میں

اپنی بات کہہ دی تھی۔
میری آواز سن کر ڈون شکارے کے دوسرے کونے سے اٹھ کر ہمارے قریب آگئی تھی۔
"بھائی جان جھگڑا کیوں کر رہے ہو آپا سے؟"
"نہیں جھگڑا نہیں کر رہا۔" میں نے ڈون کا ہاتھ پکڑ کر اسے اپنے پاس بٹھا لیا۔ "میں تو کشمیر کی کہانی سنا رہا تھا تمہاری آپا کو۔"
"کہانی اتنے غصے اور اتنی اونچی آواز میں سنائی جاتی ہے؟" اس نے بڑی معصومیت سے سوال کیا۔
"یہ ان کی عادت ہے۔" شیل نے ڈون کو بڑے پیار سے کہا اور اسے قریب کھینچ لیا۔
ڈون کے آجانے سے وہ جو ایک تناؤ سا چھا گیا تھا ہمارے ذہنوں پر وہ دور ہو گیا۔
"اچھا کوئی کشمیری گیت سناؤ ڈون۔"
"سناتی ہوں۔" اس نے بنا کسی بناوٹی تکلف کے فوراً ہی گانا شروع کر دیا۔ سہ پہر کے اس خاموش اور ساکن ماحول میں ڈون کی آواز اور بھی خوبصورت لگ رہی تھی۔ مبارک کے چپو کی دھیمی دھیمی آواز جیسے ساز کا کام دے رہی تھی ڈون کے گانے کے ساتھ۔

نشاط اور شالیمار کے پھولو!
ہمارے عزیز مہمانوں کا استقبال کرو
ہمارے یہ عزیز مہمان بہت دور سے آئے ہیں
انھوں نے بہت لمبا سفر طے کیا ہے
یہ بہت تھکے ہوتے ہیں
نشاط اور شالیمار کے پھولو!

ہمارے عزیز مہمانوں کا استقبال کرو

ڈون نے گانا ختم کیا تو شیل نے اور میں نے زور سے تالیاں بجائیں۔ مبارک نے بھی چپو چھوڑ کر تالیاں بجانا شروع کر دی تھیں۔ ڈون اس کی تالیوں کی آواز سن کر قہقہے لگاتی ہوئی ہمارے پاس سے اٹھ کر مبارک کے پاس چلی گئی۔
وہ دونوں دیر تک زور زور سے ہنستے رہے۔
جب ہم واپس پہنچے تو شام ہو گئی تھی۔

ہم بہت تھکے ہوئے تھے۔ خیال تو آیا کہ اب رمضان جُو کے ڈونگے میں نہ جائیں۔ ہاؤس بوٹ میں ہی جا کر چائے پی لیں گے۔ لیکن ڈُون کو یہ فیصلہ منظور نہیں تھا۔

"آپ نگین نہیں جائیں گے تو آبا بہت ناراض ہوں گے۔"

"ہم دونوں تمہارے ابا سے معافی مانگ لیں گے۔" میں نے کہا۔

"آپ سے تو وہ کچھ نہیں کہیں گے لیکن ان کا سارا غصّہ اماں پر اُترے گا اور اُس کی پٹائی ہو گی۔"

"ڈُون ٹھیک کہہ رہی ہے۔ ہمیں وہاں جانا چاہیئے۔"

ڈُون ہماری رہنمائی کر رہی تھی۔ جب ہم کچھ فاصلہ طے کر کے نگین پہنچے تو لگا جیسے ہم ایک بھری پُری بستی میں آ گئے تھے۔ بڑی رونق تھی یہاں کئی ہاؤس بوٹ بھی یہیں لگے تھے۔ بہت سے ڈونگے بھی تھے۔ رمضان ہمارا انتظار ہی کر رہا تھا۔

"لگتا ہے بہت لمبی سیر کرائی ہے ڈُون نے، آپ لوگوں کو۔"

"تھک کے چُور ہو گئے ہیں رمضان صاحب۔"

"تو آئیے۔" رمضان نے ہمیں اپنے ڈونگے کے سامنے لا کر کھڑا کر دیا۔

"تو یہ ہے آپ کا ڈونگا؟"

"جی۔"

ڈُون ہمیں چھوڑ کر ڈونگے کے اندر چلی گئی۔

رمضان نے ہم سے کہا۔

"ڈونگے کے اندر تو گرمی ہو گی، میں یہیں آپ کے بیٹھنے کا انتظام کرتا ہوں۔"

جس پیڑ کے ساتھ ڈونگا بندھا تھا وہاں دراصل ایک چھوٹا سا ٹاپُو تھا جس میں بید کے بڑے بڑے درخت لگے تھے اور ان کے درمیان کافی کھُلی جگہ تھی۔ ہم اس کھُلی جگہ پر کھڑے باتیں کر رہے تھے کہ ڈُون ہمارے لیے لکڑی کے دو چھوٹے چھوٹے اسٹُول لے آئی۔

"بیٹھیے آپا۔" اس نے ایک اسٹُول شیل کو پیش کیا۔

"آپ بھائی جان یہاں بیٹھیں۔" اس نے دوسرا اسٹُول مجھے آفر کیا اور پھر بولی۔

"ابا میں آپ کے لیے اسٹُول لا رہی ہوں۔"

وہ پھر ڈونگے کی طرف چلی گئی۔

"دراصل ہمارے پاس تین ہی اسٹول ہیں۔ کوئی چوتھا مہمان آجائے تو ہم سب کو کھڑا رہنا پڑتا ہے۔" اپنی بات کہہ کر رمضان جو زور سے ہنسا۔

ڈون اس کے لیے بھی اسٹول لے آئی تھی۔ وہ اس پر بیٹھ گیا۔

"تو ڈونی چائے پلاؤ ہمیں۔"

"سماوار تیار ہے۔ اٹھا کر یہیں لا رہی ہوں۔"

"اپنی اماں کو بھی ساتھ لانا۔" شیل نے کہا۔

"وہ شرما رہی ہے۔"

"شرمانے کی بات تو ہے ہی۔ چلو میں چلتی ہوں تمہارے ساتھ۔"

شیل ڈون کے ساتھ ڈونگے کی طرف چلی گئی۔

تھوڑی دیر میں ڈون سماوار اٹھا کر لے آئی اور شیل پیالیاں اور کلچے لیے، ساتھ میں ڈون کی اماں کو سنبھالے ہمارے سامنے موجود تھی۔

میں اسٹول سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور اسٹول ڈون کی اماں کی طرف بڑھایا۔

"یہ مہمانوں کے لیے ہے۔" اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ اسی طرح کی مسکراہٹ تھی جس طرح کی مسکراہٹ ڈون کے ہونٹوں پر پھیلتی تھی۔ دونوں گالوں میں گڑھے بھی تھے۔ لیکن یہ جھیلیں پانی سے نہیں بھری تھیں۔ خشک ہو گئی تھیں بہت حد تک۔ ان جھیلوں میں مرغابیاں غوطے لگا کر اپنے بھیگے ہوئے پنکھ نہیں جھاڑ رہی تھیں۔ لگتا تھا جھیلوں میں پانی سوکھ جانے کی وجہ سے مرغابیاں بھی ادھ مری ہوتی جا رہی تھیں۔ میں نے ایک بار ڈون کی ماں کے چہرے کی طرف دیکھا۔ وہاں کنول کے پھول نہیں تھے۔ ہلدی کی گانٹھیں تھیں ان کی جگہ۔ جیسے وہ کنول کے پھولوں کا نہیں، ہلدی کی گانٹھوں کا بیوپار کرتی ہو۔ ڈون کا حسن صبح کی پہلی کرنوں کا اجالا تھا۔ اس کی اماں کا حسن ڈوبتے سورج کے دھندلکے کی پرچھائیں۔ میرے من کو بہت دھکا لگا۔ شیل کو شاید مجھ سے بھی زیادہ صدمہ ہوا تھا۔

ہم سبھی کھڑے تھے۔ اب کوئی اسٹول پر نہ بیٹھا تھا۔

کھڑے کھڑے ہی ہم نے چائے پی اور خستہ خستہ کلچے بھی کھائے۔

اب رات آجانے کو تھی۔ ہاؤس بوٹوں میں بجلیاں جل اٹھی تھیں۔ ہم اجازت لے کر اپنے ہاؤس بوٹ کی طرف چل دیے۔ ڈون وہیں رک گئی تھی۔ کچھ دیر بعد آتے گی۔ رمضان

ہمارے ساتھ تھا۔ مجھے کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیسے بات شروع کروں۔ کچھ دور چلنے کے بعد میں نے کہا۔

"رمضان صاحب، ہمیں ایک ٹورسٹ نے بتایا تھا کہ کشمیر میں ابھی اپنی بیویوں کو بہت مارتے ہیں۔"

"دیکھئے یہ ٹورسٹ لوگ کتنے جھوٹے ہوتے ہیں۔ مجھے اسی ٹورسٹ نے یہ کہا کہ جموں میں عورتیں اپنے مردوں کو پیٹتی ہیں۔"

شیل اور میں دونوں بہت ہنسے۔ پھر میں نے کہا۔

"ٹورسٹ کی یہ بات تو صحیح ہے۔"

"تو پھر دوسری بات بھی ٹھیک ہے۔"

"رمضان صاحب آپ دلچسپ آدمی ہیں۔"

"آپ دونوں کی شادی کو تھوڑے ہی دن ہوتے ہیں نا؟"

"جی ہاں۔"

"تو ایک بات کہوں؟"

"کہیے۔"

"اگر آپ اپنی بیوی سے بہت شدید قسم کا پیار چاہتے ہیں تو اسے پیٹیے۔"

"کیا کہہ رہے ہیں آپ رمضان صاحب؟"

"آپ آزما لیجئے پھر مجھ سے بات کیجئے۔"

"میرے گھر والے کو غلط راستے پر مت ڈالیے۔" شیل نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"شروع شروع میں ڈون کی اماں کو اس کی کسی غلطی پر مارتا تھا تو وہ پہروں روتی تھی اور مجھ سے ناراض رہتی تھی۔ اُسے منانے کی کوشش کرتا تھا تو وہ اور روٹھتی تھی۔ پھر میں نے اسے بغیر قصور کے مارنا شروع کیا۔ راز کی بات بتاؤں صاحب؟"

"بتائیے۔"

"اب جس روز اس کی پٹائی نہیں ہوتی وہ ایک دم بے جان اور مُردہ ہو جاتی ہے۔ مار کھانے کے بعد جب میں رات کو اُسے اپنے ساتھ لٹاتا ہوں تو وہ مجھ سے ایکدم جمٹ جاتی ہے اور پھر میرے ہاتھ سے اپنی ننگی پیٹھ پر اُبھرتی ہوئی چوٹوں کو دیر تک سہلاتی ہے اور

پھر مجھے پیار کی دولت سے مالا مال کر دیتی ہے۔ مار اب فاطمہ کی زندگی کی بنیاد بن چکی ہے۔ اگر میں نے اسے مارنا چھوڑ دیا تو وہ مر جائے گی۔"

میں سر جھکائے چل بھی رہا تھا اور اس کی بات بھی سن رہا تھا۔

جب میں نے اس کی بات کا کوئی جواب نہ دیا تو وہ بولا۔

"میں آج کی رات سے ہی اسے مارنا چھوڑتا ہوں، وعدہ رہا۔ لیکن انجام کے ذمہ دار آپ ہوں گے۔"

میں نے اس کی بات کا اب بھی کوئی جواب نہ دیا۔ اور دھیرے دھیرے سر نہوڑائے چلتا رہا۔

رمضان جُو نے پھر اس سلسلے میں کوئی بات نہ کی۔

وہ ہمیں ہاؤس بوٹ میں چھوڑ کر، بجلیاں جلا کر، پانی کا انتظام کر کے اور ہم سے اجازت لے کر چلا گیا اور کہہ گیا کہ ڈُون تھوڑی دیر میں آ کر ہمیں کھانا کھلا دے گی۔ تب تک ہم آرام کر لیں۔

ڈُون آئی اور ہمیں کھانا کھلا کر چلی گئی۔

اُس نے زیادہ گفتگو نہیں کی۔ مجھے لگا جیسے رمضان جُو نے اسے ڈانٹا تھا۔ اُسے شک تھا کہ اپنی ماں کو مارنے کے بارے میں اُسی نے ہمیں بتایا تھا۔ کام سے فارغ ہو کر جب وہ جانے لگی تو میں نے بھی اسے نہیں روکا۔

اس کے جانے کے بعد رشیل ہاؤس بوٹ کی کھڑکی کے سامنے کھڑی ہو گئی اور آسمان میں چمکتے ہوتے چاند کو دیکھنے لگی۔ چاند کل رات کے مقابلے میں بڑا ہو گیا تھا۔ بس دو ایک روز میں پورنماشی آنے والی تھی۔ میں بھی آ کر رشیل کے پاس کھڑا ہو گیا اور دھیرے سے اُس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر اُسے چوم لیا۔

"کیا واقعی عورت مار کھا کر زیادہ پیار کرتی ہے؟" اس نے سوال کیا۔

تمہارے ذہن پر ابھی تک رمضان جُو کی بات کا اثر ہے؟"

"ہاں۔"

"بھول جاؤ اُسے۔" یہ کہہ کر میں نے رشیل کو اپنی بانہوں میں لے لیا۔

جانے رشیل کو کیا ہوا۔ وہ بُری طرح رونے لگی۔ میں نے اسے دلاسہ دینے کی

کوشش کی تو وہ اور زور سے رونے لگی۔
"تم زور کا ایک طمانچہ لگاؤ میرے گال پر۔"
اس نے میرا ہاتھ زور سے پکڑ لیا۔
"یہ کیا ہو گیا ہے تمہیں؟"
"طمانچہ لگاؤ زور کا میرے گال پر۔ سُن نہیں رہے ہو؟"
"یہ کیا پاگل پن ہے شیل؟"
"ہاں میں پاگل ہو گئی ہوں۔ مجھے ہوش میں لاؤ۔ ایک زوردار تھپڑ ہی مجھے ہوش میں لا سکتا ہے اب۔"
میں نے ایک ہلکی سی چپت اس کے گال پر لگائی تو وہ بپھر کر بولی۔
"نامرد ہو گیا؟ تھپڑ بھی نہیں لگا سکتے۔"
جانے مجھے کیا ہوا کہ میں نے ایک زناٹے دار تھپڑ جڑ دیا شیل کے دائیں گال پر اور پھر کھڑکی سے ہٹ کر چپ چاپ بستر پر لیٹ گیا۔
چند لمحوں کے بعد شیل آکر مجھ سے لپٹ گئی اور میرے ہاتھ سے اپنا دایاں گال سہلانے لگی جو انگارے کی طرح دہک رہا تھا۔
"آئی ایم سوری شیل۔"
اور پھر شیل نے ان آٹھ دنوں میں پہلی بار مجھ سے اس طرح ٹوٹ کر پیار کیا کہ میں بیحال ہو گیا۔ شیل انجانے میں رمضان ہانجی کی بات سچ کرنے پر تُلی ہوئی تھی۔
رات کے پچھلے پہر جب وہ تھک کر سو گئی تو میں نے اندر آتی ہوئی چاندنی میں اس کے گال کو دیکھا۔ وہ تو جیسے سُوج رہا تھا۔ میں نے دھیرے سے اپنے ہونٹ شیل کے سُوجے ہوئے گال پر رکھ دیے۔ تپش سے میرے ہونٹ جلنے لگے تھے۔ اُس نے ہلکی سی کروٹ لی تو ساری کی ساری چاندنی اس کی گردن سے ڈھلک کر اُسکی خوبصورت، سڈول چھاتیوں کی ڈھلان میں بہہ گئی۔ مجھے لگا جیسے چاندنی کی اُمڈتی ہوئی لہروں کا جھاگ، اس کی گردن کے اِردگِرد جمع ہو گیا تھا۔ میں نے اپنے ہونٹ اُس کے گال سے اٹھا کر بہتی ہوئی چاندنی کی لہروں پر رکھ دیے جو ڈھلان کے اندر دِھیرے دِھیرے جذب ہوتی جا رہی تھی اور ڈھلان کے کنارے پر سفید سفید جھاگ جمع ہو رہا تھا۔

بشیر احمد تین دن جان بوجھ کر غائب رہا تھا۔

سرینگر میں ہماری پارٹی کے جو لوگ تھے ان کا لیڈر ایک طرح سے بشیر احمد ہی تھا۔ اسی نے ہمارے لیے ہاؤس بوٹ کا بھی انتظام کیا تھا۔ یوں تو اس کے والد کا بھی ایک ہاؤس بوٹ تھا لیکن ہمارا پارٹی ورکر ہونے کی وجہ سے اس نے ہمیں اپنے والد کا ہاؤس بوٹ نہیں دلوایا تھا۔ ہم سب نہیں چاہتے تھے کہ یہاں ہماری آمد کا زیادہ چرچا ہو۔ ہم سرینگر آئے بھی تو چوروں کی طرح ہی تھے۔

ابھی ہم ناشتے سے فارغ ہوتے ہی تھے کہ بشیر احمد آگیا۔

"تم تو ہمیں ہاؤس بوٹ میں قید کروا کر غائب ہی ہو گئے، بشیر بھائی۔" شیل نے اسے اُلاہنا دیا۔

"ادھر ذرا پارٹی کے کام میں اُلجھ گیا تھا، معافی چاہتا ہوں۔"

"آتے ہی میری بیوی سے معافی مانگنا شروع کر دی۔"

"اس لیے کہ پھر تمہاری ڈانٹ سے بچ جاؤں گا۔" بشیر نے ہنستے ہوئے کہا۔

"چائے پیو گے، بشیر بھائی۔"

"پی کر آ رہا ہوں۔"

"تو کیا خبر ہے؟"

"آج تم لوگوں کے گھومنے پھرنے کا تو کوئی پروگرام نہیں؟"

"میں شیل کو مارتنڈ کے مندر اور مٹن کا تیرتھ استھان دکھانا چاہتا تھا۔"

"اس پروگرام کو کل پر ملتوی کر دو۔ میں بھی تمہارے ساتھ چلوں گا۔ پہلگام تک ہو کر آئیں گے۔"

"ہم تو تمہارے مہمان ہیں بشیر بھائی۔ حکم تو تمہارا ہی چلے گا۔"

"دراصل پچھلے دو روز سے محمد علی جناح سرینگر آئے ہوئے ہیں۔ غضنفر علی اور کچھ دوسرے مسلم لیگی لیڈر پہلے ہی آچکے تھے۔"

"کس غرض سے آتے ہیں یہ لوگ؟"
"مسلم کانفرنس اور نیشنل کانفرنس کا مسئلہ حل کرانے کے لیے۔"
"یہ مسئلہ تو ہمارا ہے۔ باہر کے لوگ اس میں کیا کریں گے؟"
"اس میں شیخ عبداللہ کی رضامندی بھی شامل ہے۔"
"تو آج کیا ہونے والا ہے؟" شیل نے پوچھا۔
"پرتاپ پارک میں جناح صاحب کو نیشنل کانفرنس کی طرف سے استقبالیہ دیا جارہا ہے۔"
"تو ہم کیا کریں گے وہاں؟"
"بحیثیت نیشنل کانفرنس کے ایکٹو ورکرز کے ہمیں استقبالیہ میں شامل ہونا چاہئے۔ شیخ صاحب سے بھی ملاقات ہو جاتے گی۔"
"میں تو اِدھر دوبارہ نہیں آسکوں گا اب۔ آپ خود ہی آجائیے گا۔ آپ بھی آئیے گا شیل جی۔"
"اسے رہنے دو میں آجاؤں گا۔"
"جلسے کے بعد ورکرز کی بھی ایک میٹنگ رکھ لیں گے۔ آپ ان سے بات کیجئے اور بتائیے کہ جموں میں کیا صورت حال ہے؟"
"ٹھیک ہے بشیر احمد۔ تم چلو، میں پہنچ جاؤں گا پرتاپ پارک۔" بشیر احمد چلا گیا تو شیل نے کہا۔
"مجھے لگتا ہے یہاں کے ورکرز کچھ زیادہ ایکٹو ہیں۔"
"اِس کی دو وجہیں ہیں۔ ایک تو یہ کہ شیخ صاحب کا یہاں کے ورکرز سے گہرا رابطہ ہے اور دوسری وجہ یہ ہے کہ سرینگر میں دونوں کانفرنسیں زیادہ مضبوط ہیں۔ برخلاف اس کے جموں میں نیشنل کانفرنس ابھی تک انڈین نیشنل کانگریس کے زیر اثر ہے۔ ابھی اس کی اپنی آئی ڈینٹیٹی پوری طرح سے اُبھری نہیں ہے۔"
"ایک وجہ اور بھی ہو سکتی ہے شاید۔"
"وہ کیا؟"
"وہاں کی ہندو اکثریت ابھی ڈوگرہ فیوڈل اِزم کی جانی دشمن نہیں بنی ہے۔" شیل یہ کہہ کر مسکرائی۔

"جیسی دشمن تم ہو میری۔"

"بس یہی سمجھ لو۔"

"تو میں فیوڈل اِزم کا سمبل ہوں اور تم سوشلزم کا۔"

"تم تو جاگیردار ہو ہی۔"

"تم ہی تو ہو میری جاگیر۔ میری بھری پری سلطنت۔"

"جیسے چاہو ظلم توڑو اپنی رعایا پر۔ میرا گال دیکھا ہے؟"

"اس میں قصور کس کا تھا؟"

"رعایا کا، حکمران ظلم تو کرتا ہی نہیں۔ ظلم تو بے چاری رعایا ہی کرتی ہے۔"

"ہائے بیچاری رعایا۔" میں نے رشیل کو اپنی آغوش میں کھینچ لیا۔ اس کے دائیں گال کو دیکھا۔ میری انگلیوں کے مدھم سے نشان ابھی تک موجود تھے وہاں۔ مجھے بیحد افسوس ہوا۔

ڈون دوبارہ آئی تھی۔

"آج تو تمہاری اماں کو نہیں مارا تمہارے ابا نے۔" رشیل نے پوچھا۔

"نہیں آپا۔"

"اب وہ مارے گا بھی نہیں۔" میں نے کہا۔

"مجھے یقین نہیں، بھائی جان۔"

"یقین تو مجھے بھی نہیں" رشیل بولی۔

"خدا پر بھروسہ رکھو ڈون۔ وہ کارساز ہے۔" رشیل کی بات کے بعد میرے لیے اور کچھ کہنا مشکل تھا۔ وہی بہتر جانتی تھی۔

"تمہارے بھائی جان کسی جلسے میں جا رہے ہیں۔ تم تو میرے پاس ہی رہو گی۔"

"آپ کے پاس ہی رہوں گی۔"

"مجھے سماوار میں چائے بنانا سکھا دو آج۔"

"سکھا دونگی۔ میں ڈونگے سے سماوار لے آؤں گی۔"

"اپنے ابا سے کہنا میرے لیے ایک بڑھیا سا سماوار بھی خرید دیں۔"

"ساتھ میں سبز چائے کی پتّی بھی منگوا لینا۔" میں نے سجھا دیا۔

"وہ تو میں ہی لادوں گی۔" ڈون نے مسکراتے ہوئے کہا۔
"اچھا تم سماوار میں چائے بناؤ۔ میں جاتا ہوں۔"
میں نے غیرارادی طور پر شیل کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر اسے ہلکا سا دبا دیا اور پھر ہاؤس بوٹ سے باہر نکل آیا۔

پرتاپ پارک میں لوگوں کے ٹھٹھ لگے تھے۔ پنڈال کو بہت خوبصورتی سے سجایا گیا تھا۔ تھوڑے تھوڑے فاصلے پر قومی نعرے اور علامہ اقبال کے شعر لکھے تھے "جناح صاحب زندہ باد" اور "شیرِ کشمیر زندہ باد" بھی خاص خاص جگہوں پر لکھے ہوئے تھے۔ محمد علی جناح سٹیج پر چڑھے تو شیخ صاحب نے انھیں بڑی گرمجوشی سے اپنی بانہوں میں سمیٹ لیا۔ اس کے بعد شیخ صاحب نے خیر مقدم کیا اور پھر پنڈت جیالال کلم نے خطبۂ استقبالیہ پڑھا۔ کلم صاحب کشمیری پنڈتوں کے جانے پہچانے لیڈر تھے۔ جناح صاحب بہت خوش تھے۔ وہ تقریر کے لیے کھڑے ہوئے اور کہا۔

"سرینگر میں میرا جو استقبال آج کیا گیا ہے، اس پر تو ایک بادشاہ بھی فخر کرسکتا ہے۔"
اپنی تقریر میں انھوں نے ایک چُبھتی ہوئی بات بھی کہہ دی۔ اس پر جیالال کلم اور نیشنل کانفرنس کے کچھ لوگ ناراض ہوکر سٹیج سے اُٹھ کر چلے گئے۔
"میرے خیال میں میرا یہ استقبال آل انڈیا مسلم لیگ کے صدر کی حیثیت سے ہوا ہے۔ اس لیے یہ لیگ کے اصولوں کا بھی استقبال ہے۔"

جب ہمارے پارٹی ورکرز کی میٹنگ ہوئی تو یہ انکشاف ہوا کہ جناح صاحب نے شیخ صاحب کو یہ رائے دی تھی کہ وہ مسلم کانفرنس کے سربراہ چودھری غلام عباس کے ساتھ بیٹھ کر باہمی مشاورت سے مسئلے کو سلجھائیں۔ شیخ صاحب کو ان کی یہ تجویز پسند نہیں تھی۔ انھوں نے تو بلکہ جناح صاحب کو یہاں تک کہہ دیا کہ وہ کوہالہ کے پار مسلمانانِ ہند کے مسلمہ لیڈر تھے لیکن وہ کوہالہ کے اس پار مہاراجہ کی ہمنوائی کرتے رہے تھے۔ اس لیے بہتر یہی تھا کہ وہ یہاں کے لوگوں کو ان کے حال پر چھوڑ دیں اور مقامی سیاست سے لاتعلق رہیں۔

یہ صاف ظاہر ہوگیا تھا کہ جناح صاحب واضح طور پر مسلم کانفرنس کی پُشت پناہی کر رہے تھے اور شیخ صاحب اور نیشنل کانفرنس سے دُور ہوتے جارہے تھے۔ ان ہی دنوں مسلم کانفرنس کا سالانہ اجلاس ہونے والا تھا۔ اس کے لیے پونچھ کو منتخب کیا گیا تھا۔ لیکن جناح صاحب کے

سرینگر میں ہونے کی وجہ سے یہ فیصلہ کیا گیا کہ یہ اجلاس جامع مسجد سرینگر میں منعقد کیا جائے نیشنل کانفرنس کے کارکن اس سے خوش نہیں تھے۔ انھوں نے شیخ صاحب سے اجازت چاہی کہ جب جناح صاحب مسلم کانفرنس میں تقریر کریں تو ان سے ایسے سوالات کیے جائیں جن کا وہ تسلی بخش جواب نہ دے سکیں۔ لیکن شیخ صاحب نے یہ مشورہ دیا کہ جناح صاحب کی تقریر کے دوران کسی قسم کی مداخلت نہ کی جائے۔ البتہ انھوں نے یہ کہا کہ اگر تقریر کے دوران جناح صاحب نے کچھ قابلِ اعتراض نکتے اٹھائے تو شیخ صاحب اگلے روز ایک الگ جلسہ کریں گے اور اس میں ان نکتوں کا جواب دیں گے۔ جیسی کہ اُمید کی جا رہی تھی جناح صاحب نے اپنی تقریر میں کشمیر کے مسلمانوں کو مسلم کانفرنس کا ساتھ دینے کی تلقین کی اور نیشنل کانفرنس کے خلاف باتیں کیں۔

وہ تقریر میں نے بھی سُنی۔ میرے ساتھ بشیر احمد اور دوسرے ساتھی بھی تھے۔ ہم سب کو جناح صاحب کی تقریر پر اعتراض تھا۔ ہم سب کی یہ رائے تھی کہ شیخ صاحب نیشنل کانفرنس کے ایک جلسے کو خطاب کریں اور جناح صاحب کے اٹھائے گئے سوالوں کا تفصیل سے جواب دیں۔ شیخ صاحب نے ہماری بات مان لی اور اگلے دن ہی نواب بازار میں ایک بہت بڑے اجتماع سے خطاب کیا اور جناح صاحب کی تقریر کا جواب دیا اور پاکستان کے مطالبے کی بھرپُور مخالفت کی۔ شیخ صاحب کو سننے کا یہ میرا پہلا موقع تھا۔ وہ واقعی بہت اچھے مقرر تھے۔ اور سامعین کی نبض کو پہچانتے تھے۔ ان کے دلائل بہت وزن دار تھے اور اپنی تقریر کے ساتھ لوگوں کو بہالے جاتے تھے۔ ان کی یہ تقریر بڑی موثر اور کامیاب رہی۔ اس کے بعد لوگوں میں کافی جوش پھیل گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس طرح کے جلسے دو تین دنوں تک ہوتے رہے اور جناح صاحب کچھ گھبرا سے گئے۔ اس کے بعد انھوں نے کسی پبلک جلسے کو خطاب نہیں کیا اور حکومت کے مہمان بن کر ایک ہاؤس بوٹ میں آرام کرنے لگے۔ سر بی این راؤ نے جو اُن دنوں وزیر اعظم تھے، موقعہ کی نزاکت کو پہچان لیا اور شہر میں دفعہ ۱۴۴ کا نفاذ کر دیا۔ اس طرح ہر روز جلسے منعقد کرنے کا سلسلہ ختم ہو گیا۔

میرے سرینگر میں کچھ روز آجانے کا فائدہ یہ ہوا کہ میری یہاں کے نیشنل کانفرنس کے ورکرز سے واقفیت ہو گئی اور شیخ صاحب سے ملاقات کا بھی موقعہ مل گیا۔ اُن سے ملاقات کر کے میں اس بات کا بھی قائل ہو گیا کہ جس جدوجہد میں ہم لوگ شریک تھے وہ جائز تھی اور یہ کہ صرف نیشنل کانفرنس کے پلیٹ فارم ہی سے ڈوگرہ فیوڈل ازم کے خلاف موثر آواز

اُٹھائی جا سکتی تھی۔ اس سے میرے اپنے خیالات کو بھی تقویت ملی اور میں نے اپنے آپ میں یہ فیصلہ کر لیا کہ میں ایک آدھ روز میں جموّں لوٹ جاؤں اور وہاں جا کر اپنی پارٹی کو مضبوط کروں اور ہندو مسلم اتّحاد کا جو عملی رُوپ میں نے سرینگر میں دیکھا تھا اُسے جموّں میں بھی اُجاگر کرنے کی کوشش کروں۔ مجھے اس بات کا یقین ہو گیا کہ ہم سب کو ایک صحت مند قومی نظریہ اپنانے کی ضرورت تھی۔ اسی میں ہماری ریاست کی اور سارے ملک کی بھلائی مضمر تھی۔

ان تین چار دنوں کے دوران شیل ایکدم تنہا ہو گئی۔ جلسوں میں وہ جانا نہیں چاہتی تھی۔ بشیر احمد کے علاوہ اسے کسی اور ورکر میں دلچسپی نہیں تھی۔ ان دنوں صرف ذُون ہی اس کی واحد ساتھی تھی۔ اس نے یہ کیا کہ ذُون کی مدد سے کشمیری کھانے بناتی رہی اور رات کو بڑے پیار سے مجھے کھلاتی رہی۔ شیل نے ایک طرح سے کشمیر کے مشہور دستر خوان جسے "وازوان" کہا جاتا ہے، کو تیار کرنے میں پوری مہارت حاصل کر لی۔

ایک شام جب میں بشیر احمد اور اس کے دو اور دوستوں کے ساتھ واپس آیا تو شیل اور ذُون دونوں نے ہماری بڑی تواضع کی۔

"شیل جی، آپ ہمارے کسی بھی جلسے میں نہیں آئیں۔" بشیر احمد نے کہا۔

"بس جھجک سی رہی من میں۔"

"آپ کے آنے سے ہماری کچھ خواتین ورکرز کو بھی حوصلہ ملتا۔"

"لیڈی ورکرز ہیں آپ کے ساتھ؟"

"بہت کم ہیں۔ ہمارے اپنے گھروں کی ہی کچھ لڑکیاں ہیں۔ آپ آتیں تو کچھ اور ورکرز بھی شامل ہو جاتیں۔"

"جموں میں تو کافی لڑکیاں ہیں ہمارے ساتھ۔"

"یہاں تعلیم کی بھی کمی ہے۔ کچھ ویسے بھی لڑکیاں ابھی آزادی سے باہر نہیں آتیں۔"

"مجھے تو شیخ صاحب سے ملنے کی بڑی خواہش تھی۔"

"ان سے بھی ملاقات ہو جاتی۔"

"بھائی، بڑی بھرپور شخصیت ہے اُس شخص کی۔" میں نے درمیان میں اپنی بات کہہ دی۔

"آپ جموّں میں کوئی بڑا جلسہ کریں۔ ہم لوگ شیخ صاحب کو لے کر آئیں گے۔"

"یہاں کے جلسے دیکھ کر تو یہ ضروری ہو گیا ہے کہ وہاں بھی کوئی بڑا اجتماع کیا جائے۔"

"آپ جب چاہیں ہم اپنے ورکرز لے کر جموّں آجائیں گے۔"

"شکریہ۔ میں سوچ رہا ہوں کہ پرسوں ہم جموّں چلے جائیں۔"

"کل کیوں نہیں؟" شیل نے مسکرا کر مجھے ٹوک دیا۔

"کل تمہیں مارتنڈ اور مٹن گھمالائیں۔" میں نے کہا۔

"تو میرا خیال ابھی ہے تمہیں۔ میں تو سمجھی تھی کہ میرا پتّہ کٹ گیا۔"

"تمہارا پتّہ کیسے کٹ سکتا ہے۔ مجھے تو ابھی جموّں جاکر جواب طلبیاں بھگتنی ہیں۔"

"تو کل میں آپ کے ساتھ چلوں گا۔ کل کی سیر میرے ذمّے۔" بشیر احمد نے بڑے حوصلے سے کہا۔

"تو پھر میرا پتّہ کٹ گیا سمجھو۔" ڈون جو اب تک خاموش تھی بول اُٹھی۔

"تم تو میری اُستانی ہو۔ شاگرد اُستاد کے بغیر کیسے کہیں جاسکتی ہے؟" شیل نے جواب دیا۔

"تو بشیر اب ہم دونوں مارے گئے۔" میں نے کہا۔

"تو ہمارا کیا ہوگا؟" بشیر احمد کے دونوں ساتھیوں میں سے ایک نے پوچھا۔

"عزیزو، تم بھی ہمارے ساتھ مارے جاؤ گے۔"

زوردار قہقہوں کی پچکاریاں چھوٹ گئیں ہاؤس بوٹ کے اندر۔ لگا ساری فضا انسان دوستی کے رنگوں اور خوشبوؤں سے شرابور ہوگئی تھی۔

اگلے دن ہم چاروں کا قافلہ مارتنڈ، مٹن، پہلگام اور آونتی پورہ میں گھومتا گھُماتا جب سرینگر پہنچا تو روشنیاں جل اٹھی تھیں۔ رمضان جو ہاؤس بوٹ میں ہمارا انتظار کر رہا تھا۔ فیصلہ یہ ہوا تھا کہ اگلی صبح ہم جموّں کے لیے روانہ ہوجائیں گے۔ رمضان جو ہمارے لیے ایک بڑا خوبصورت سماوار اور سبز چائے کا ایک پیکٹ لے آیا تھا۔ شیل سماوار دیکھ کر بہت خوش ہوئی اور اس نے کہا کہ وہ سب کو اپنے ہاتھ سے چائے بنا کر پلائے گی۔

ڈون کو ہم نے جانے کو کہہ دیا کیونکہ وہ بہت تھکی ہوئی تھی۔ حالانکہ وہ جانا نہیں چاہتی تھی اور یہ رات جوائس کے ہاؤس بوٹ میں ہماری آخری رات تھی، شیل کے ساتھ گزارنا چاہتی تھی، لیکن شاید شیل یہ چاہتی تھی کہ اس رات کوئی بھی تیسرا شخص ہاؤس بوٹ میں نہ ہو جو اُس کے اور میرے درمیان حائل ہو۔ اس لیے اس نے بڑی حکمت عملی کے ساتھ ڈون کو اپنے آبا کے سنگ

واپس بھیج دیا۔

"تو میں آپ کو کھانا کھلا کر چلی جاؤں گی۔"

"تم بہت تھکی ہوئی ہو۔ جا کر آرام کرو۔ صبح بے شک جلدی آجانا۔"

"لیکن بھائی جان کو کھانا کون کھلائے گا؟"

"تمہاری آپا کھلائے گی جواب تمہاری شاگرد بھی ہے۔"

معصوم ذوُن خاموش ہو گئی اور تھوڑی کے بعد رمضان جُو کے ساتھ چلی گئی۔

آج پورے چاند کی رات سے پہلے کی رات تھی۔ آج کے چاند میں اور پُورنماشی کے چاند میں کوئی زیادہ فرق نہیں تھا۔ شیل اور میں ہاؤس بوٹ کی چھت پر چلے گئے۔ جہلم کے سُست رفتار پانی میں جیسے چاندی گھُلی ہوئی تھی۔ سارا ماحول چاندنی میں جگمگا رہا تھا۔ کہیں کوئی آواز نہیں تھی۔ ایکدم سناٹا تھا۔ کبھی کبھار چنار کے درختوں میں رات گزارنے والے پرندوں کی ملی جُلی آوازیں گونج اٹھتی تھیں جن سے فضا میں ایک ارتعاش سا لہرا جاتا تھا۔ شیل ایکدم خاموش تھی۔ اور ٹکٹکی باندھے آسمان میں دھیرے دھیرے تیرتے ہوئے چاند کو دیکھ رہی تھی۔

پھر اس نے اچانک سوال کیا۔

"کل ہے نا پُورنماشی؟"

"ہاں، شیل۔"

"کل ہم یہاں سے چلے جائیں گے؟"

"صبح ہی کسی بس سے۔"

"ہم ایک دن اور نہیں رُک سکتے کیا؟"

"رُک سکتے ہیں۔ ایک دن کے لیے تو خیرات کی رقم بچی ہے ہمارے پاس۔"

"تو رُک جاؤ۔"

"ٹھیک ہے۔"

پھر شیل نے کوئی بات نہیں کی۔ چند لمحوں کے بعد وہ مجھے ہاؤس بوٹ کی چھت پر اکیلا چھوڑ کر نیچے چلی گئی اور میں سوچتا رہا کہ اسے اچانک یہ کیا ہو گیا تھا۔ شاید اسے اپنی ماں یاد آ گئی تھی جس نے کل پُورنماشی کا برت رکھنا تھا اور ست نارائن کی کتھا سُننی تھی۔ اگر یہ بات تھی تو اسے ایک دن پہلے سرینگر سے جانے کی ضد کرنی چاہیئے تھی۔ لیکن اُس نے تو

جانے کو نہیں بلکہ ایک دن اور یہاں رُکنے کو کہا تھا۔ میں چھت پر اکیلا کھڑا اُوٹ پٹانگ باتیں سوچنے لگا جن کا مجھ سے یا رشیل سے دُور کا بھی تعلق نہ تھا۔

کچھ دیر کے بعد میں بھی نیچے آگیا

رشیل نے روشنی بجھا دی تھی اور بستر پر لیٹی ہوئی تھی۔ کھڑکی سے اندر آتی چاندنی میں اُسے بستر پر بے حس و حرکت پڑا دیکھ کر میں ڈر گیا۔ میں نے دو تین بار اس کا نام لے کر اسے پُکارا لیکن اس کے جسم میں کوئی حرکت نہ ہوئی۔ پھر میں نے اسے چیخ کر پکارا اور اسے زور سے جھنجھوڑ دیا۔ وہ رو رہی تھی۔

"کیا بات ہے رشیل؟"

اس نے کوئی جواب نہ دیا اور مجھ سے لپٹ کر اور شدت سے رونے لگی۔

"کیا ہو گیا ہے تمہیں؟"

"تم مجھے چھوڑ تو نہیں دو گے؟" وہ چیخی۔

"یہ کیا پاگل پن ہے؟"

"پاگل تھی اسی لیے تو تمہارے ساتھ بھاگ آئی تھی۔"

"افسوس ہو رہا ہے؟"

"نہیں، نہیں، نہیں۔" اس نے ایک بار زور سے مجھے اپنے ساتھ چمٹا لیا اور اپنی برستی ہوئی آنکھیں میرے چہرے پر رکھ دیں۔ میں اس کی پیٹھ سہلا رہا تھا اور اس کی آنکھوں سے برستے آنسوؤں کو اپنے ہونٹوں سے پیتے جا رہا تھا۔ پھر رشیل اچانک سنبھل گئی اور بولی۔

"اس رات مجھے تھپڑ مار کر تمہیں افسوس ہوا تھا؟"

"بہت افسوس ہوا تھا۔"

"کیوں؟"

مجھے ایسا نہیں کرنا چاہتے تھا۔ مجھ میں اور رمضان جُو میں آخر کیا فرق رہ گیا تھا پھر؟"

"بتاؤں کیا فرق ہے تم میں اور رمضان جُو میں؟"

یہ کہہ کر اس نے میرے گالوں پر دھڑا دھڑ تھپڑ مارنے شروع کر دیے اور پھر چند ہی لمحوں کے بعد میرے گالوں کو پاگلوں کی طرح چُومنا شروع کر دیا۔ وہ روتے جا رہی تھی اور میرے گالوں کو چُومے جا رہی تھی۔ میں بے حس و حرکت بستر پر پڑا تھا اور رشیل کے اس رویے پر حیران

ہو رہا تھا۔

پھر اس نے مجھے چومنا بند کر دیا۔

اس کی آنکھوں سے برستے آنسو بھی رُک گئے۔

اور کچھ ہی دیر بعد وہ کروٹ لے کر بے سُدھ پڑ گئی۔

پُورے چاند کی رات سے پہلے کی رات کی بھرپُور چاندنی کے سیلاب نے ہمیں پوری طرح ڈبو دیا تھا۔ لگتا تھا کہ ہم دونوں کہیں پاتال کی اسیم گہرائیوں میں کھو جائیں گے اور اب کبھی کنارے تک نہ پہنچ سکیں گے۔

جب رات کے پچھلے پہر میری آنکھ کھلی تو شیل نے مجھے اپنے ادھ ننگے بدن سے چمٹا رکھا تھا۔ مجھے لگا جیسے میں سمندر کے ساحل کی ٹھنڈی ٹھنڈی شبنم آلود ریت پر بے سُدھ لیٹا تھا، اور خُنک چاندنی میرے تھکے ہوئے نڈھال جسم کو دِھیرے دِھیرے سہلا رہی تھی۔

جب میں جاگا تو سورج طلوع ہو چکا تھا۔

شیل بہت پہلے جاگ گئی تھی اور نہا دھو کر تیار بھی ہو چکی تھی۔ ڈون نے مجھے چائے کی پیالی دیتے ہوئے بتایا کہ آج شیل کا برت تھا اور اُس نے چائے بھی نہیں پی تھی اور وہ اُس وقت ہاؤس بوٹ کی چھت پر بیٹھی بھگوان کا نام لے رہی تھی۔ میرے لیے یہ ایکدم نئی بات تھی۔ جہاں تک مجھے معلوم تھا وہ ایک طرح سے ناستک تھی اور کبھی مندر نہیں جاتی تھی۔ اس کے کہنے کے مطابق وہ صرف اپنی ماں کی خواہش کا احترام کرتے ہوئے اُسے پورنماشی کے دن ست نارائن کی کتھا ضرور سُنا دیتی تھی لیکن اس میں اس کی اپنی آستھا بالکل نہیں تھی۔ میں چائے کی پیالی ہاتھ میں لیے ہاؤس بوٹ کی چھت پر چلا گیا۔ شیل واقعی آنکھیں بند کیے آلتی پالتی مارے بیٹھی تھی۔ اس کے گیلے بال اس کے شانوں پر بکھرے ہوئے تھے اور وہ زیرلب کچھ بولتی جا رہی تھی۔ غالباً ماں کی خواہش کا احترام کرتے ہوئے وہ اس سے دو سو میل کی دُوری پر بیٹھی ست نارائن کی کتھا کا اُچارن کر رہی تھی، اُن سب حصّوں کا جو بار بار پڑھتے رہنے سے اُسے زبانی یاد ہو گئے تھے۔ اس لیے کہ اس کی ماں نے آج پورنماشی کا برت رکھا ہو گا۔

مجھے شیل کو اس حالت میں دیکھ کر خیال آیا کہ جو لوگ خدا کی ہستی میں یقین نہیں رکھتے اُن کے اندر شک اور خوف کا کوئی جذبہ ضرور سُلگتا رہتا ہے اور وہ اسے کسی نہ کسی بہانے شانت کرتے رہتے ہیں۔ خدا پر یقین نہ رکھنا ہی اس کی ذات سے مُنکر ہو جانے کے لیے کافی نہیں۔ اس کے لیے

بہت شدید قسم کی قوّتِ ارادی کی بھی ضرورت ہے جو ہم میں سے بہت ہی کم لوگوں کو نصیب ہے۔
میں چھت سے نیچے اتر آیا۔
جب رشیل اپنے گیلے بالوں کو سنبھالتی نیچے آئی تو میں نے اس سے کوئی سوال نہیں کیا۔
صرف اتنا پوچھا۔
"تمہارا آج برت ہے کیا؟"
"ہاں۔"
"کس لیے رکھا ہے برت؟"
"اپنے من کی شُدھی کے لیے۔"
"تمہارا من اشُدھ ہو گیا ہے کیا؟"
"ہو گیا تھا۔" یہ کہہ کر وہ مسکرائی۔
" مجھے رات کی تمام گھٹنا یاد آگئی اور جواب میں مَیں بھی مُسکرا دیا۔
مَن کی شُدھی اور اُشدھی کا کتنا بڑا رول ہے ہماری زندگیوں میں۔ یہی سوچ رہا تھا میں۔
آج میرا کہیں بھی جانے کو جی نہیں کر رہا تھا۔ میں ناشتہ کر کے کچھ دیر سو گیا اور رشیل ذُون کو ساتھ لے کر اسے دینے کے لیے بازار سے کچھ خریدنے چلی گئی تھی۔ اس کی غیر حاضری میں بشیر احمد آیا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ ہم جانے کو تیار ہوں گے لیکن جب میں نے اسے بتایا کہ ہم ایک دن اور رُک گئے تھے تو وہ بہت خوش ہوا۔
آج رات کو کھانا آپ دونوں میرے گھر کھائیں گے۔"
"رشیل کا آج برت ہے۔ اس لیے وہ تو کھانا نہیں کھائے گی لیکن ہم لوگ شام کو تمہارے گھر ضرور آئیں گے۔"
"گاؤکدل میں میرا گھر ہے۔ رمضان چاچا جانتا ہے۔ میں اس سے کہہ جاؤں گا وہ آپ کو میرے گھر لے آئے گا۔"
"یہ ٹھیک ہے۔"
"میں بھی تھوڑے دنوں میں جموّں آؤں گا۔ وہاں نیشنل کانفرنس کو مضبوط کرنے کی ضرورت ہے۔"
"ضرورت تو ہے ہی تم ضرور آؤ۔ ہمیں تمہاری مدد درکار ہے۔"

بشیر احمد کے جانے کے بعد میں پھر سو گیا۔ رات کی گھٹنا کا اثر اب تک میرے ذہن پر حاوی تھا۔

ڈون جب شیل کے ساتھ واپس آئی تو وہ بہت خوش تھی۔ شیل نے اسے اس کی مرضی کے کپڑے خرید دیے تھے۔ وہیں بازار میں انھیں مبارک بھی مل گیا تھا جو اپنے شکارے میں ہمیں پانچ دن پہلے ڈل کی سیر کراتا رہا تھا اور ڈون جس کے ساتھ بیٹھ کر اور باتیں کر کے بہت خوش ہوتی رہی تھی۔

"آپ کو کہیں گھما لاؤں صاحب؟" مبارک نے پوچھا۔

"نہیں مبارک، آج مجھے کچھ بہت ضروری کام کرنے ہیں۔"

"تو آپا کو گھما لاؤں؟"

"اگر وہ جانا چاہتی ہے تو اسے لے جاؤ۔ مگر ڈون کو ضرور لے جانا ساتھ۔" وہ ذرا سا شرمایا بھی اور مسکرایا بھی۔

جو آپ کا حکم صاحب۔"

لیکن شیل کو میرے بغیر کہیں جانا منظور نہیں تھا۔ اس لیے مبارک کی تجویز سرے نہیں چڑھی۔ کچھ دیر کے بعد مبارک چلا گیا۔

شیل نے مجھے بتایا کہ آج لوگ امرناتھ کی یاترا پوری کریں گے اور برف کے شو لنگ کے درشن کریں گے جو پچھلے پندرہ دن میں گپھا کے اندر چھت سے ٹپکتے ہوتے بوند بوند پانی کے منجمد ہونے سے کل رات مکمل ہوا ہوگا۔ جانے کہاں سے یہ معلومات حاصل کر لائی تھی وہ۔

"تمہیں معلوم ہے امرناتھ کی کہانی؟"

"معلوم ہے۔ میں تو کچھ سال پہلے امرناتھ کی یاترا بھی کر آیا تھا۔"

"کیسے گئے تھے۔"

"اپنے فادر کے ساتھ جو اس یاترا کے انتظامات کی دیکھ بھال کرنے کے انچارج تھے۔"

"پھر تو بڑے مزے رہے ہوں گے تمہارے؟"

"لیکن سردی بہت تھی۔ بارش ہو جانے سے تو سردی اور بھی بڑھ گئی تھی۔ گھوڑے پر بیٹھے بیٹھے تو میرے پاؤں بھی سن ہو گئے تھے۔"

"تم نے درشن کیے تھے شو لنگ کے؟"

"ہاں، جی ہوتی دودھ گنگا میں نہایا بھی تھا۔ یہ اور بات ہے کہ دیر تک کانپتا رہا تھا۔ وہ تو فادر کے ماتحتوں نے مجھے گرم گرم چائے پلائی اور موٹے موٹے کمبل اوڑھا دیے۔"

"نہیں تو؟"

"نہیں تو رام نام ست ہو جاتا۔"

"اصل میں بنیادی طور پر تم بہت غلط قسم کے آدمی ہو۔ جو جی میں آتے بک دیتے ہو۔" شیل نے ڈانٹتے ہوتے کہا۔

"مجھے تمہاری راتے سے اتفاق ہے۔"

"امرناتھ کی کہانی سناؤں؟"

"نہیں، مجھے نہیں سننی ہے کہانی۔ پھر کوئی نہ کوئی فضول بات کہہ دوگے۔"

امرناتھ کی کہانی بیچ ہی میں رہ گئی۔ میری بہت سی کہانیاں اسی طرح ادھوری رہ جاتی ہیں۔ پوری نہیں ہو پاتیں۔ جانے کیوں ہوتا ہے ایسا میرے ساتھ؟ کبھی تو سننے والا میرا ساتھ نہیں دیتا۔ کبھی میں ہی تھک کر سنانا بند کر دیتا ہوں اور کبھی تو کہانی ہی مجھے روک دیتی ہے۔ کہانی خود ہی نہیں چاہتی کہ میں اسے مکمل کروں۔ کچھ کہانیاں تو خود بھی مکمل ہونا نہیں چاہتیں! کہانیاں بڑی صبر آزما اور ظالم ہوتی ہیں!

کوئی کب تک ان کا ظلم اور جبر برداشت کرتا رہے!

آخر کب تک!!

اس رات ڈون اپنے ڈونگے میں واپس نہیں گئی۔

وہ شیل کے ساتھ ہی بستر پر پڑی رہی۔ دونوں گئی رات تک آپس میں کھسر پھسر کرتی رہیں۔ جانے دونوں مل کر کس کہانی کی تکمیل کرنا چاہتی تھیں!

میری کہانی بدستور نامکمل رہی!

حالانکہ اس کے نامکمل رہنے کی کوئی وجہ نہیں تھی آج۔ شاید شیل کے من کی شدھی اور اشدھی کا سوال تھا۔ اور یہی سوال میری نامکمل کہانی کا عنوان بن کر ساری رات میری روح کے کاغذ پر سلگتا رہا۔

اگلے دن ہم پہلی بس سے جموّں کے لیے روانہ ہو گئے۔

اُن دنوں سرینگر سے جموں پہنچنے میں دو دن لگتے تھے۔ سڑک اتنی اچھی نہیں تھی اور بسیں بھی اعلیٰ درجہ کی نہیں ہُوا کرتی تھیں۔ مسافروں کو ایک رات راستے میں گزارنی پڑتی تھی۔ اس کا انحصار اس بات پر ہوتا تھا کہ بس سرینگر سے کب چلی تھی۔ جلدی چلنے والی بسوں کا ہالٹ اکثر رام بن یا بٹوت میں ہوتا تھا۔ دیر سے چلنے والی بسیں بانہال میں رُک جاتی تھیں۔ لیکن رات گزارنے کا انتظام کہیں بھی اچھا نہیں تھا۔ ہوٹل بہت کم تھے اور گھٹیا قسم کے تھے۔ کھانا بھی بس واجبی ہی سا ملتا تھا۔ اکثر مسافر تو سڑک کے کنارے ہی بستر ڈال کر پڑے رہتے تھے۔ جن مسافروں کے پاس کچھ پیسہ تھا وہ کسی ہوٹل کے کمرے میں رات گزارتے تھے اور تمام رات کھٹمل ان کا خون چوستے رہتے تھے۔ ایک دن میں بسوں کا سرینگر سے جموّں اور جموّں سے سرینگر پہنچ جانے کا انتظام تو بہت بعد میں شروع ہوا۔ جب جواہر ٹنل بن گیا اور سڑک کے بہت سے خم نکال دیے گئے اور نئی اور ڈی لکس بسیں اس رُوٹ پر چلنا شروع ہو گئیں۔ اب تو دونوں شہروں سے صبح سات اور آٹھ بجے کے درمیان ایک ہی ساتھ کئی بسیں نکلتی ہیں اور دونوں طرف کے مسافر دوپہر کو بٹوت پہنچ جاتے ہیں۔ دوپہر کا کھانا وہیں کھاتے ہیں جہاں اب بے شمار چھوٹے چھوٹے ہوٹل اور ڈھابے بن گئے ہیں۔

شام تک دونوں طرف کے مسافر اپنے ٹھکانوں پر پہنچ جاتے ہیں۔ اب آمدورفت کی دِقتیں تو ختم ہو گئی ہیں لیکن دوسری قسم کی دِقتیں پیدا ہو گئی ہیں جن کا سامنا کرنا آسان نہیں۔ کچھ ایسے مسئلے اچانک اُبھر آتے ہیں جن کا حل ڈھونڈنا بے حد ضروری ہے ورنہ انسانی رشتوں کی عظمت اور بقا خطرے میں پڑ جاتے گی۔ دوستیوں میں تلخیاں رچ جائیں گی اور قربتیں فاصلوں میں بدل جائیں گی۔

ہماری بس چلی تو ٹھیک سمے پر تھی لیکن بانہال پہنچ کر خراب ہو گئی تھی اور مسافروں کو دو گھنٹے سڑک پر گزارنے پڑے تھے، جہاں سوائے پہاڑوں سے رِس رِس کر نکلتے ہوئے پانی کی چھوٹی چھوٹی دھاروں کے کچھ بھی نہیں تھا۔ لوگ پہاڑوں کی کوکھ سے رِستے ہوتے ٹھنڈے پانی کو پیتے رہے تھے اور سڑک کے کنارے پر اُگے پیڑوں کے سایے میں بیٹھے بس کے ٹھیک ہونے کا

انتظار کرتے رہے تھے۔ رشیل اور میں بھی ایک پیڑ کی چھاؤں میں بیٹھے اپنا اگلا پروگرام مرتب کرنے لگے تھے۔

"کل شام جموں پہنچ کر ہم جائیں گے کہاں؟" رشیل نے پوچھا۔

"تم بتاؤ کہاں جائیں گے؟"

"مجھے تو تمہارے ساتھ جانا ہے۔ جہاں لے چلو گے، چل پڑوں گی۔"

"اپنے گھر تو میں جا نہیں سکتا۔ تمہارے گھر چلیں؟"

"تم اکیلے چلے جاؤ وہاں۔ میں تو نہیں جاؤں گی۔"

"مجھے مروانا چاہتی ہو؟"

"جو کیا ہے اسے بھگتو۔"

"تم نہیں بھگتو گی؟ تمہارا بھی تو برابر کا رول ہے اس سارے ڈرامے میں۔"

"وہ تو بھگتوں گی ہی۔ لیکن کچھ سوچنا تو چاہیئے اس کے بارے میں۔"

"ہم ایک چھوٹا سا مکان کرایے پر لے لیں گے۔"

"لیکن کل ہی تھوڑا مل جائے گا مکان؟"

"میں نے گندوترا کو لکھ دیا تھا۔ شاید اس نے کوئی انتظام کر دیا ہو۔"

ہمارے اگلا پروگرام مرتب کرنے کی تگ و دو کے دوران بس ٹھیک ہو گئی تھی اور ڈرائیور زور زور سے ہارن بجا رہا تھا۔ ادھر اُدھر بکھرے سب مسافر بس میں بیٹھنے لگے۔ رشیل اور میں دونوں نے بیٹھنے سے پہلے پہاڑوں سے رستے ہوتے ٹھنڈے پانی کے کچھ گھونٹ پی لیے۔ میرا یہ وشواش ہے کہ کئی بار گاڑیاں، بسیں یا کاریں راستے میں کسی اُجاڑ یا سنسان جگہ پر صرف اس لیے خراب ہو جاتی ہیں کہ آپ کو وہاں کے کنویں، یا ندی یا چشمے کا پانی پینا ہوتا ہے۔ جہاں ہماری بس اس دن خراب ہوئی تھی اس کے بعد کوئی ایسی بس، یا کار یا ٹرک خراب نہیں ہوا، جس میں میں سوار تھا۔ کیونکہ اس جگہ کا جتنا پانی مجھے پینا تھا میں پی چکا تھا۔ بس میں بیٹھنے کے بعد جب میں نے اپنے اس وشواس کے بارے میں رشیل سے بات کی تو وہ زور سے ہنس دی اور بولی۔

اِن چیزوں پر اتنا وشواس ہے تمہیں؟"

"ہاں، اٹوٹ وشواس۔"

"تو میرے گھر کا پانی تم کب پیو گے؟"

"جب ہماری گاڑی خراب ہو کر تمہارے گھر کے سامنے رُک جائے گی۔"
ہم دونوں اتنا زور سے ہنسے کہ آس پاس کی سیٹوں پر بیٹھی سواریاں بڑی حیرت سے ہماری طرف دیکھنے لگیں۔
جب ہم شام کو جموّں پہنچے تو بے چارا گندوترا دو تین دوستوں کے ساتھ دوپہر سے ہمارے انتظار میں بس سٹینڈ پر کھڑا تھا۔ اِن میں رشیل کی ایک دوست سُبھاشنی مہاجن بھی شامل تھی۔ مجھے بس سے اُترتا دیکھکر گندوترا میری طرف لپکا اور مجھے اپنے بازوؤں میں لے لیا۔
"خوش آمدید۔" اُس نے کہا
میں اس کے دوستوں سے ہاتھ ملا ہی رہا تھا کہ سُبھاشنی مہاجن نے آگے بڑھ کر رشیل کو اپنی بانہوں کے گھیرے میں لے لیا۔
"بڑی صحت بنا کر آئی ہو۔" اس نے رشیل سے کہا۔
"ورزش کرتی رہی ہوں۔"
"ہاؤس بوٹ کے اندر یا شنکر آچاریہ کی پہاڑی پر؟"
"چُپ کر، بے شرم۔" رشیل نے ڈانٹ دیا۔
پھر ہم نے اپنا مختصر سا سامان بس سے اُتروایا، جس میں سب سے قیمتی سامان سماوار تھا جو ہمیں رمضان جُو نے پیش کیا تھا۔
"کہاں چلنا ہے ہمیں، گندوترا؟" میں نے پوچھا۔
"اپنے نئے کرایے کے گھر میں۔"
"تو آپ نے گھر بھی لے لیا؟" رشیل نے کہا۔
"ہمارے لیڈر کا یہی حکم تھا۔"
ہم تانگے میں بیٹھ گئے۔ گندوترا اور میں اگلی سیٹ پر، رشیل اور سُبھاشنی مہاجن پچھلی سیٹ پر۔ ہمارے دونوں پارٹی ورکرز سائیکل پر سوار ہمارے ساتھ ساتھ ہو لیے۔
ریزیڈینسی روڈ سے ذرا ہٹ کر گلی میں ایک نئے بنے مکان کے سامنے تانگہ رُک گیا۔ مکان کے نچلے حصے میں مالک مکان خود رہتا تھا جو اُودھم پور کا ایک مہاجن تھا اور کنک منڈی میں اس کی دوکان تھی۔ اس کے ساتھ اس کی بیوی اور ایک بیٹا رہتے تھے۔ بیٹا چند دن پہلے پرنس آف ویلیز کالج میں داخل ہوا تھا۔ اوپر والا حصہ سُبھاشنی مہاجن نے ہمارے

لیے کرایے پر لیا تھا۔ دو کمرے، رسوئی اور غسل خانہ تھا۔ سُبھاشنی نے ایک مہینے کا کرایہ مالک مکان کو پہلے ہی دن دے دیا تھا۔ سُبھاشنی مہاجن کے فادر وکالت کرتے تھے اور اُدھم پور ہی کے رہنے والے تھے۔

مالک مکان تو گھر میں نہیں تھا۔ لیکن اس کی بیوی گھر پر تھی۔ اسی سے دعا سلام کر کے ہم سیڑھیاں چڑھ کر اوپر کی منزل میں آ گئے۔ پہلے کمرے میں دو آرام کرسیاں اور تپائی رکھی تھی۔ دوسرے کمرے میں دو چارپائیاں تھیں جن پر نئے بستر بچھے تھے۔

"کمال ہے گندوترا!" میں نے کہا۔

"یہ سب سُبھاشنی کا جادو ہے!"

"تم نے کیا ہے یہ سب؟" رشیل نے سُبھاشنی مہاجن سے پوچھا۔

"سب نے مل کر کیا ہے۔" اس نے جواب دیا۔

"ذرا اپنی رسوئی بھی تو دیکھ لو۔" گندوترا نے رشیل کو مخاطب کیا۔

رشیل سُبھاشنی کے ساتھ رسوئی دیکھنے چلی گئی۔ نیا اسٹوو، آٹا، دال، چینی، چاول، چھوٹے چھوٹے ڈبوں میں بند۔ سبھی کچھ موجود تھا۔

"یہ سب کہاں سے لائی ہو؟"

"مالک مکان کی دوکان سے، ایک مہینے کے اُدھار پر۔" سُبھاشنی جواب دیتے ہوئے واپس ہمارے کمرے میں آ گئی۔

"لیکن رسوئی میں کام کون کرے گا؟"

"ہمارا لیڈر۔" اس کا اشارہ میری طرف تھا۔

جواب سُن کر سب ہنسنے لگے۔

تھوڑی دیر میں مالک مکان کا لڑکا رام رتن ایک لوٹے میں چائے اور خالی پیالیاں لے آیا۔ اس نے باری باری سب کو چائے کی پیالی پیش کی۔ چائے کے بعد گندوترا اور سُبھاشنی مہاجن تو رک گئے۔ دوسرے دو پارٹی ورکرز چلے گئے۔ گندوترا نے بتایا کہ پچھلے چند دنوں میں سرینگر میں مسلم کانفرنس اور نیشنل کانفرنس کے جلسوں کا جموّں کی فضا پر بھی اثر پڑا تھا۔ تالاب کھٹیکاں کی مسجد میں مسلم کانفرنس نے کتنی جلسے کیے تھے اور خوب زہر اُگلا تھا۔ مسلم کانفرنس کے لیڈروں نے لوگوں سے یہ بھی کہا تھا کہ جناح صاحب جموّں آ رہے تھے۔

اور وہ ایک بہت بڑے جلسے میں تقریر کریں گے۔ تالاب کھٹیکاں کا محلہ ہمارے اس گھر سے زیادہ دور نہیں تھا۔ نیشنل کانفرنس نے بھی دو ایک جلسے کیے تھے لیکن وہ بہت زور دار نہیں تھے۔

"لیکن سرینگر میں تو ہمارے جلسے کامیاب رہے تھے۔ جناح صاحب ایک جلسے میں بولنے کے بعد پھر کسی جلسے میں نہیں آتے۔" میں نے کہا۔

"اب یہاں بھی کوئی بڑا جلسہ ہونا چاہیئے۔"

"گندوترا، میں بشیر احمد سے بات کر آیا ہوں۔ وہ بھی چند دنوں میں یہاں آجاتے گا۔ میری بات شیخ صاحب سے بھی ہوتی ہے۔ انھوں نے بھی جموّں آنے کا وعدہ کیا ہے۔ سچ پوچھو تو میں شیخ صاحب سے بہت متاثر ہوا ہوں۔ وہ صحیح معنوں میں عوامی لیڈر ہیں۔"

"کالج کی بہت سی لڑکیاں بھی ہمارے ساتھ ہیں۔" سبھاشنی مہاجن نے کہا۔

بشیر احمد کہہ رہا تھا کہ سرینگر میں مہلا ورکرز کی کمی ہے۔" شیل بولی۔

"یہاں ایسی بات نہیں ہے۔ ضرورت پڑی تو ہم کچھ ورکرز کو سرینگر بھی لے جائیں گے۔" سُبھاشنی نے کہا۔ اپنی بات کہتے ہوتے وہ کچھ جذباتی بھی ہوگئی تھی۔ رات کا کھانا بھی ہماری مکان مالکن نے ہی بھجوایا۔ بلکہ رام رتن کے ساتھ وہ خود بھی اوپر آئی اور اُس نے شیل سے کہا کہ جس کسی چیز کی ضرورت ہو وہ نیچے آواز دے کر منگوا لیا کرے۔

جموّں میں اُن دِنوں ایک عجیب رواج تھا، جس سے انسانی رشتوں کو بڑی تقویت ملتی تھی۔ جموّں کے عوام دوستی میں بڑا یقین رکھتے تھے۔ دوستی کے بہت سے اصول میں نے ان ہی لوگوں سے سیکھے ہیں۔ عام، سیدھے سادے، کم پڑھے لکھے لوگ، جو اقتصادی لحاظ سے بھی آسودہ نہیں تھے۔ جموں میں یہ عام رواج تھا کہ جب کوئی کسی مکان کو کرایے پر لیتا تھا اور اپنا سامان نئے گھر میں لاتا تھا تو اس دن نئے کرایے دار کا سارا خاندان مالک مکان کا مہمان ہوتا تھا۔ یہاں تک کہ مالک مکان اپنے بستر بھی دیدیتا تھا، تاکہ ان لوگوں کو ان چھوٹی چھوٹی باتوں کی وجہ سے تکلیف نہ ہو۔ کئی بار یہ مہمان نوازی تھوڑی کر کے کئی دن تک چلتی رہتی تھی۔ اس لیے ایک بار کراتے پر مکان لینے کے بعد کرایے دار کئی کئی برسوں تک اسی مکان میں رہتے تھے۔ اب یہ صورتحال جموں میں بھی کافی حد تک بدل گئی ہے لیکن پھر بھی کہیں کہیں اس کی خوبصورت پرچھائیاں ابھی تک زندہ ہیں اور اس

حقیقت کی گواہی دیتی رہتی ہیں کہ فیوڈل ازم کے دور میں بھی جموں میں انسانی قدروں کی پرستش کی جاتی تھی اور انھیں مضبوط کرنے کی کوششیں عمل پذیر تھیں۔

ہمیں اپنا گھر بسانے میں کئی روز لگ گئے۔ سُبھاشنی مستقل طور پر شیل کے ساتھ تھی اور ہر کام میں اس کی مدد کرتی تھی۔ لیکن مجھے لگا کہ شیل اس نئے ماحول سے خوش نہیں تھی۔ جن سہولتوں اور آرام کی وہ اپنے گھر میں اتنے برسوں سے عادی رہ چکی تھی، وہ سب کچھ اچانک اس سے چھن گیا تھا۔ جس چارپائی اور جیسے بستر پر اُسے یہاں سونا پڑ رہا تھا، ایسی چارپائیوں اور ایسے بستروں پر تو اُس کے ملازم سوتے تھے۔ چھت کا ایک پنکھا تو ہم نے کرایے پر لے لیا تھا لیکن تیز چلانے پر وہ بہت آواز دیتا تھا، جس سے شیل رات کو بہت ڈسٹرب ہوتی تھی۔ ایک رات اس نے کھیج کر کہا۔

"پنکھا کرایے پر ہی لینا تھا، تو کوئی اچھا سا پنکھا تو لیتے۔ اتنی آواز دیتا ہے کہ ساری رات نیند نہیں آتی۔"

"نیند تو مجھے بھی نہیں آتی۔"

"صرف ڈائیلاگ بولنے سے گرہستی نہیں چلتی، حضور۔"

"تو کس سے چلتی ہے؟"

"کچھ کام دھندہ کرنے سے۔ صرف خیرات سے نہیں۔"

شیل نے تو یہ کڑوی بات کہہ کر کروٹ لے لی لیکن میرے لیے رات گزارنا عذاب ہو گیا۔ میں سوچنے لگا کہ کیا وہ لڑکی ان سنسکاروں سے کبھی مکت ہو سکے گی، جن کے درمیان وہ پروان چڑھی تھی۔ اس کی آئیڈیل عورت تو اس کی ماں تھی، جس کے سامنے کوئی بولنے کی بھی جرأت نہ کر سکتا تھا۔ یا اس کا فادر تھا جو اپنی بیوی سے ڈرتا تھا لیکن اپنے سے کمزور آدمیوں پر جبر کرتا تھا۔ وہ لڑکی جس کے دل و دماغ پر اس طرح کی متضاد کیفیتوں کا اثر کئی برسوں تک رہا ہو، اپنے آپ کو ایکدم کیسے بدل سکے گی۔ پھر میں نے حالات کا جائزہ لیا۔ میری ماں کتنی خلیق، نرم اور مہربان قسم کی عورت تھی جو کسی سے اُونچا بھی نہیں بول سکتی تھی۔ اس کے برخلاف میرا فادر کبھی نرم لہجے میں بات بھی نہیں کر سکتا تھا۔ خود میں بھی تو متضاد کیفیتوں کا ہی شکار رہا تھا۔ شاید اسی لیے ذہنی طور پر باغی بن گیا تھا۔ لیکن صرف باغی ہو جانے سے تو معاملہ حل نہیں ہوتا۔ بغاوت کرنے کے لیے بھی تو کچھ سادھن درکار ہوتے ہیں، صرف ایک

سٹیج اور چند سُننے والے تو کافی نہیں ہوتے، بغاوت کے لیے۔ صرف نعرے لگانے سے تو انقلاب نہیں آیا کرتے۔ کچھ ذرائع تو ہونے ہی چاہئیں۔ سوچ جتنی گہری ہوتی گئی مجھے یہ شک ہونے لگا کہ جس جدوجہد میں اتنے لوگ شریک تھے، کیا اس میں ہمیں کامیابی نصیب ہوگی؟ کیا رشیل اس اتنے بڑے سنگھرش میں آخر تک میرا ساتھ دے سکے گی؟ سوچ کے اسی موڑ پر پہنچ کر شاید میں تھک گیا تھا کیونکہ اس کے بعد مجھے نیند آگئی تھی، حالانکہ کرایے کے چھت کے پنکھے کی آواز اسی طرح قائم تھی۔

اگلے دن میں نے نیا پنکھا خرید لیا تھا اور کرایے کا پنکھا "ہابسن" والوں کو واپس کر دیا تھا، جنہیں مہینے کا کرایہ پیشگی ادا ہو چکا تھا۔

انھیں دنوں دو غیر متوقع گھٹنائیں ہوئیں۔

پہلی گھٹنا تو یہ تھی کہ میرے والد نے میرے خلاف گرفتاری کے وارنٹ جاری کروا دیے تھے۔ ایک دن صبح سویرے ریزیڈینسی روڈ کے پولیس سٹیشن سے ایک ہیڈ کانسٹیبل میرے وارنٹ لے کر آیا تھا اور مجھے پولیس سٹیشن چلنے کو کہا تھا۔ رشیل اس سے بحث کرنے لگی تھی۔ میں نے اسے روک دیا اور تیار ہو کر ہیڈ کانسٹیبل کے ساتھ پولیس سٹیشن چلا گیا۔ ایس ایچ او کے کمرے میں میرے والد بیٹھے تھے۔ میرے وہاں پہنچنے پر پولیس کا سارا عملہ اُٹھ کر چلا گیا اور میں اور میرے والد کمرے میں اکیلے رہ گئے۔

"سُنا ہے تم کسی لڑکی کے ساتھ کرایے کے مکان میں رہ رہے ہو؟"

"وہ لڑکی میری بیوی ہے۔"

"ہمیں تو معلوم نہیں تم نے کب شادی کی؟"

"آپ کو بتانے کی ضرورت نہیں تھی۔"

"جانتے ہو اس کا انجام؟"

"نہیں۔"

"لڑکی کے گھر والوں نے تمہارے خلاف اغوا کا کیس درج کرایا ہے۔"

"یہ غلط ہے۔"

"تو اب تمہارا کیا ارادہ ہے؟"

"میں اپنی بیوی کے ساتھ الگ رہوں گا اور پارٹی کا کام کروں گا۔"

"کونسی پارٹی ہے تمہاری ؟"

"نیشنل کانفرنس ۔"

"اس پر پابندی لگائی جارہی ہے اور سب لیڈر گرفتار کیے جارہے ہیں ۔"

"تو میں بھی گرفتار ہو جاؤں گا سب کے ساتھ ۔"

"پارٹی نہیں چھوڑوگے ؟"

"جی نہیں ۔"

"میرا یہ سمجھاؤ ہے کہ یہ گھٹیا قسم کی سیاست چھوڑ دو اور اپنی بیوی کو لیکر اپنے گھر آجاؤ۔ تمہاری ماں بہت پریشان ہے ۔"

"میں ماں سے مل کر اس سے بات کرلوں گا ۔"

"اس سے بات کرنے کی ضرورت نہیں، جو کچھ کہنا ہے مجھ سے کہو ۔"

"آپ سے مجھے کچھ نہیں کہنا ۔"

"تو میں تمہیں فارغ خطی دیتا ہوں ۔"

"لکھ کر دید یجئے گا تاکہ میں آپ کی حکومت کو اس کی اطلاع دے سکوں اور میری وجہ سے آپ کے خلاف کوئی کارروائی نہ ہو سکے ۔"

"تم حد سے گزرتے جارہے ہو ۔"

"اس کے لیے معافی چاہتا ہوں ۔"

"تو جاؤ ۔ میٹ یور فیٹ ۔" یہ کہہ کر میرے والد کمرے سے اُٹھ کر چلے گئے ۔

تھوڑی دیر کے بعد تھانے دار کمرے میں آیا اور مجھے کہا کہ میں گھر واپس جا سکتا تھا ۔

اس دن میں نے اپنے والد کے دفتر کو لکھ کر بھیج دیا کہ میرا میرے والد سے کوئی تعلق نہیں رہا تھا اور میں نے ان سے فارغ خطی حاصل کرلی تھی ۔ دو دن کے بعد میری ماں مجھ سے ملنے آئی ۔ میں گھر سے نکلنے ہی والا تھا کہ ماں سیڑھیاں چڑھ کر میرے کمرے میں آگئی ۔ میں نے جھک کر اس کے پاؤں چھوتے اور اس نے مجھے آشیرواد دیا ۔ شیل نے اپنا سر ماں کے پاؤں پر رکھ دیا ۔ ماں نے اُسے اُٹھا کر گلے سے لگا لیا ۔

اس نے ایک ریشمی شلوار قمیص دی اور اس کے گلے میں سونے کی ایک زنجیر بھی ڈال دی ۔ شیل کی آنکھوں میں آنسو آگئے ۔

"میں تمہیں لینے آئی ہوں۔ اپنے گھر چلو۔"

"مجھے کوئی اعتراض نہیں ماں جی۔ اپنے بیٹے سے پوچھ لیجئے۔"

"تم اپنے گھر جا رہی ہو۔ کہیں پردیس تو نہیں جا رہی۔"

"لیکن اِن کی اجازت ضروری ہے۔"

ماں نے پھر مجھے مخاطب کیا اور کہا۔

"بہو سے کہو، میرے ساتھ گھر چلے۔"

"کس کے گھر ماں؟"

"اپنے گھر۔"

"ہمارا گھر تو یہی ہے جس میں ہم لوگ اس وقت بیٹھے ہوتے ہیں۔ میرا تو کوئی گھر ہے ہی نہیں کہیں۔"

"تمہارے ماں باپ کے گھر کی بات کر رہی ہوں۔"

"ماں باپ کے گھر سے تو میرا رشتہ کٹ چکا ہے۔"

"کٹ کیسے چکا ہے؟"

"پتا جی نے مجھے فارغ خطی دیدی ہے۔"

"یہ غلط ہے۔" وہ روہانسی آواز میں بولی۔

"میں نے ان کے دفتر والوں کو بھی لکھ دیا ہے۔ اب میرا اس گھر سے کسی قسم کا تعلق نہیں۔ اب میں بالکل آزاد ہوں۔ جہاں اور جس طرح زندگی گزارنا چاہوں، گزار سکتا ہوں۔"

ماں بہت روئی۔ اس نے بڑی منت کی لیکن میں نے اپنے دل پر پتھر رکھ لیا اور اپنے کسی بھی نرم جذبے کی کونپل کو اُبھرنے نہیں دیا۔ شیل بھی بہت روئی۔ اس کے من میں ضرور یہ بات تھی کہ مجھے اپنی ماں کی بات مان لینی چاہیئے تھی۔ لیکن دھیرے دھیرے طوفان اُتر گیا۔ ماں نے رونا بند کر دیا اور پھر وہ مکان کی سیڑھیاں اُترنے لگی۔ میں اور شیل بھی اس کے پیچھے پیچھے سیڑھیاں اُترنے لگے۔ ماں ڈیوڑھی پر پہنچی تو میں نے اس کے پاؤں چھوئے اور میں پھوٹ پڑا۔

"مجھے معاف کر دو ماں، میرے اصولوں کی مجبوریاں ہیں۔"

ماں نے مجھے اپنے سینے سے لگا لیا اور ایک بار پھر اس کی آنکھوں سے آنسو برسنے لگے۔ جب شیل نے اس کے پاؤں چھوئے تو ماں نے دوپٹے کے چھور سے آنسو پونچھتے ہوئے

اس سے کہا۔

"بیٹی اگر تمہارے اصول تمہارا راستہ نہ روکیں تو کبھی مجھ سے ملنے آجانا۔"

"آؤں گی ماں جی۔"

پھر ہم دونوں نے ماں کو تانگے پر بٹھایا اور جب تک تانگہ ریزیڈینسی روڈ سے آگے نہ نکل گیا ہم دونوں کی آنکھیں اس پر گڑی رہیں۔

اپنے گھر سے میرا آخری رشتہ بھی کٹ گیا تھا۔ میرے اپنے خیال میں اب میں پوری طرح مکت ہو گیا تھا۔

دوسری گھٹنا کے بارے میں مجھے کئی دنوں کے بعد پتہ چلا۔ رشیل کی ماں بیمار تھی۔ یہ اطلاع اسے سُبھاشنی مہاجن نے دی تھی۔

ایک دوپہر کو جب میں گندودترا کے ساتھ پارٹی کے کسی کام سے گیا ہوا تھا۔ رشیل اپنے گھر گئی تھی۔ گھر کے ملازم کئی دنوں کے بعد اسے دیکھ کر بہت خوش ہوتے تھے۔ وہ سیدھی ماں کے کمرے میں چلی گئی۔ ماں کئی تکیوں کا سہارا لیے بستر پر لیٹی تھی۔ اس نے آنکھیں بند کر رکھی تھیں۔ پنکھا بڑی دھیمی رفتار سے چل رہا تھا اور دُور کونے میں رکھے لیمپ سٹینڈ سے شیڈ کے اندر سے ہلکی ہلکی روشنی نکل رہی تھی۔

"ماں! میں رشیل ہوں!"

ماں نے اس کی آواز سُن کر آنکھیں کھولیں۔

"میرا سندیسہ نہیں ملا تھا؟" اس کی آواز کا لہجہ بہت کمزور تھا۔

"مل گیا تھا۔ کام بہت تھا اس لیے جلدی نہیں آسکی۔"

"اس بدمعاش نے نہیں آنے دیا ہوگا۔ اِدھر آجاؤ میرے پاس۔"

جملے کا پہلا حصہ بڑا تلخ تھا۔ رشیل نے بڑی آہستگی سے جواب دیا۔

"وہ بڑا شریف آدمی ہے ماں۔" یہ کہتے ہوئے وہ ماں کے سرہانے بیٹھ گئی اور اُس کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیے۔ اُس کی ماں کے ہاتھ کتنے ٹھنڈے تھے۔

"مجھے میعادی بُخار ہو گیا تھا۔ ابھی چار پانچ دن پہلے ہی ٹوٹا ہے۔"

"بہت کمزور ہو گئی ہیں آپ؟"

"ہاں۔ دھیرے دھیرے ٹھیک ہو جاؤں گی۔"

"پتا جی کہاں ہیں ؟"

"وہ آج صبح رام نگر گئے ہیں۔ کل واپس آئیں گے۔"

"ان کی صحت تو ٹھیک ہے ؟"

"ٹھیک ہے۔" یہ کہہ کر ماں نے کروٹ لی اور اپنا چہرہ شیل کے قریب کر لیا اور بولی۔

"اپنے گھر آ جاؤ۔ اُس کو بھی بے شک ساتھ لے آؤ۔ یہ اتنی بڑی جائیداد تمہاری ہی تو ہے۔ میرے جیتے جی سنبھال لو آ کر۔"

"جاگیرداری کے خلاف ہی تو لڑ رہے ہیں ہم لوگ۔"

"لڑتے رہو۔ لیکن اپنی جاگیر تو سنبھالو۔"

شیل ہنس پڑی تھی اور پھر اس نے کہا تھا۔

"سنبھال بھی لوں گی تو ساری جاگیر دوسروں میں بانٹ دوں گی۔ ہم دونوں کی قسمت میں تو کنگالی ہے، ماں جی۔"

اُسی لمحہ گھر کی سب سے پرانی نوکرانی گُلابو کمرے میں داخل ہوئی۔ پھلوں کا رس لائی تھی اپنی مالکن کے لیے۔

"شیل کے لیے نہیں لائی۔"

"لے آئی ہوں رانی جی۔"

شیل نے ماں کو سہارا دے کر اور تکیوں کی ترتیب بدل کر پلنگ پر ٹھیک سے بٹھا دیا اور پھر پھلوں کے رس کا گلاس اس کے ہونٹوں سے لگا دیا۔ گُلابو گلاس ٹرے میں رکھے ایک طرف کھڑی رہی۔ ماں نے جب رس پی لیا تو شیل نے اپنے دوپٹے کے ایک چھور سے ماں کا مُنھ پونچھا اور دوبارہ اسے بستر پر لٹا دیا۔

پھر اس نے گلابو کے ہاتھ سے دوسرا گلاس لیا اور ایک ہی گھونٹ میں ختم کر کے خالی گلاس ٹرے میں رکھ دیا۔

"اب تو آپ کہیں نہیں جائیں گی نا رانو جی ؟" گُلابو نے شیل کو مخاطب کیا۔

"نہیں۔" شیل نے مسکراتے ہوئے کہا۔

گُلابو خوش ہو کر کمرے سے باہر جانے لگی تو پھر لوٹ آئی۔

"کیا بنواؤں رانو جی آپ کے لیے ؟"

"کھچڑی جو ایک دم گھی میں ڈوبی ہو"، شیل نے ہنستے ہوتے کہا۔

"اچھا رانو جی"، گلابو مسکراتی ہوئی کمرے سے باہر نکل گئی۔

شام سے پہلے شیل واپس آگئی تھی۔ لیکن اس کے من پر بڑا بوجھ تھا۔ وہ بےحد اداس تھی۔ یہ ٹھیک تھا کہ اس نے مجھے پیار کیا تھا اور اپنے ماں باپ کی مرضی کے خلاف مجھ سے شادی کی تھی اور اتنی بڑی جائیداد کی واحد وارث ہونے کے باوجود اس نے اپنے لیے تنگدستی اور بےآرامی کی زندگی کا چناؤ کیا تھا۔ لیکن یہ احساس تو اسے ہوتا ہی تھا کہ اس دشوار رستے پر چلنا اس کے لیے آسان نہیں تھا۔ مشکل یہ تھا کہ وہ اپنا دُکھ درد کسی سے بانٹ بھی نہیں سکتی تھی۔ مجھ سے تو وہ اس لیے ایسی باتیں نہیں کرتی تھی کہ میری اپنی اُلجھنیں ہی بہت تھیں اور ان کا سامنا کرنا ہی مشکل تھا۔ پارٹی کا کام سنبھالنے کی زیادہ ضرورت تھی۔ اس کے لیے وقت اور محنت دونوں درکار تھے۔ ہم لوگ ایک بہت بڑی کانفرنس کرنا چاہتے تھے اور ہمارے پاس ذرائع بہت کم تھے۔ مین پاور بھی اتنی نہیں تھی۔ ان سب باتوں کو دیکھتے ہوتے شیل اپنے ذاتی مسئلوں میں مجھے نہیں اُلجھاتی تھی۔

لیکن اس رات وہ اتنی زیادہ پریشان تھی کہ اپنے آپ پر اس کے ضبط کا بندھ ٹوٹ گیا۔

"آج میں ماں کو دیکھنے گئی تھی۔"

"اچھا ہی کیا تم نے۔"

"تم ناراض تو نہیں ہو۔ تمہیں بتایا جو نہیں تھا۔"

"اپنی بیمار ماں سے ملنے کے لیے مجھ سے پُوچھنا کیوں ضروری ہے؟"

"تمہیں معلوم تھا کہ ماں بیمار ہے؟"

"ہاں سُبھاشنی نے بتایا تھا۔ میں تو بلکہ خود تمہیں کہنے والا تھا کہ ماں کو دیکھ آؤ۔"

"سچ کہہ رہے ہو؟"

"اس میں جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت ہے۔"

ماں نے مجھے کہا تھا کہ میں تمہیں بھی ساتھ لے کر اپنے گھر واپس آجاؤں۔"

"تم نے کیا جواب دیا؟"

"میں نے انکار کر دیا۔"

"کیوں؟"

"تمہارے اصولوں کا سوال تھا۔"

"صرف میرے اصولوں کا؟"

"نہیں۔ میں بھی شامل ہوں اس میں۔"

"سشیل، مجھے لگتا ہے کہ تم خوش نہیں ہو۔ جس زندگی کی تم عادی رہ چکی ہو، وہ میں تمہیں نہیں دے سکتا۔"

"میں نے مانگا ہے کبھی تم سے کچھ؟"

"نہیں۔ ہمارے کچھ ذاتی تقاضے ایسے ہوتے ہیں جن کے پورے نہ ہونے پر ہمیں ان کی کمی کا احساس رہتا ہے۔"

"وہ احساس تو رہنا بھی چاہیئے۔"

"تو اس سے تمہاری زندگی کے سموچے ڈھانچے پر اثر نہیں پڑتا؟"

"پڑتا بھی ہے اور نہیں بھی پڑتا۔"

"میں تمہاری بات نہیں سمجھا۔"

"یہ سب تمہاری سوچ کے پروسیس پر ڈیپینڈ کرتا ہے۔ جواہر لال نہرو کے کپڑے پیرس سے دھل کر آتے تھے اور مہاتما گاندھی اپنی ڈیڑھ گز کی دھوتی خود دھوتے ہیں۔ بوتھ ٹو کامپرومائزز۔"

"لگتا ہے بڑی سمجھدار ہو کر آئی ہو اپنے گھر سے۔"

"سمجھدار ہو کر نہیں، دکھی ہو کر آئی ہوں۔ ماں ایکدم ٹوٹ گئی ہے۔"

"اور اس کا دربار؟"

"تم مذاق نہ کرو۔ وہ بہت پریشان ہے آجکل۔"

میں نے گفتگو کو آگے نہیں بڑھایا۔ سشیل اور زیادہ دکھی ہوتی۔ پھر ادھر اُدھر کی باتیں کرنا شروع کر دیں تاکہ اس کی توجہ ہٹ جائے۔ مگر مجھے لگا کہ ہمارا قریبی مستقبل کوئی بہت زیادہ روشن اور پرسکون نہیں تھا۔

بشیر احمد اپنے کچھ ساتھیوں سمیت آگیا تھا۔ ایک بہت بڑی کانفرنس کرنے کا پلان تھا۔ کانفرنس میں شیخ صاحب نے آنے کا وعدہ کیا تھا۔ کئی دنوں تک ہم اسی پروجیکٹ میں اُلجھے رہے۔ بشیر احمد اور گند وتا دونوں بڑی تن دہی سے کام میں جٹے تھے۔ اس کے لیے ہم سب

دوڑ دھوپ کر رہے تھے ۔ حکومت چاہتی تھی کہ یہ کانفرنس نہ ہو ۔ اس لیے وہ طرح طرح کے حربے استعمال کرنے لگی تھی ۔ ایک حربہ یہ بھی تھا کہ میرے والد پر دباؤ ڈالا جاتے اور مجھے کانفرنس سے الگ کیا جائے ۔ حکومت کو یہ اطلاع دینے پر بھی کہ میں نے فارغ خطی لے لی تھی، سرکار نے میرے والد پر دباؤ ڈالنا جاری رکھا ۔ کانفرنس بڑی کامیاب رہی لیکن شیخ صاحب کچھ مجبوریوں کی وجہ سے جموں نہیں آسکے ۔ بشیر احمد اور اس کے ساتھی واپس سرینگر چلے گئے ۔

لیکن ہوا یہ کہ میرے والد کو جموں سے اُودھم پور ٹرانسفر کر دیا گیا ۔ بیٹے کے گناہوں کی سزا اُس کے باپ کو مل رہی تھی ۔ مجھے واقعی بہت افسوس ہوا ۔ ہم سب اپنے اپنے رول کا جائزہ لینے لگے اور پارٹی کو مضبوط کرنے کے لیے جو کچھ کیا جاسکتا تھا اس کے بارے میں گہرائی سے سوچنے لگے ۔ ان ہی دنوں ایک شام سرینگر سے رمضان جُو آگیا ۔ اس کے پاس میرے نام بشیر احمد کا خط بھی تھا ۔ جس میں مجھے سرینگر آنے کے لیے کہا گیا تھا ۔ رمضان جُو ہمارے پاس ہی ٹھہرا ۔ ذُون اور اس کی ماں نے شیل کے لیے چھوٹی موٹی چیزوں کا ایک اچھا خاصا ذخیرہ بھیجا تھا ۔

رمضان نے بتایا کہ ذُون کی شادی طے ہو گئی تھی ۔

"کس سے شادی کر رہے ہیں ذُون کی، رمضان چاچا ؟" شیل نے پوچھا ۔

"مبارک سے ۔ وہ ہمارا رشتہ دار بھی ہے ۔"

"مبارک اچھا لڑکا ہے ۔" میں نے حامی بھری ۔

"آپ لوگوں کو پسند ہے ؟"

"ہاں ۔"

"ذُون اور اس کی ماں نے مجھے اس لیے بھیجا ہے کہ آپ سے ذاتی طور پر ذُون کی شادی میں شرکت کے لیے درخواست کروں ۔"

"ہم ضرور آئیں گے رمضان چاچا ۔ ذُون تو میری چھوٹی بہن ہے ۔"

"اور میں اس کا بھائی جان ۔" میں نے ہنستے ہوتے کہا ۔

رمضان جُو مجھ سے بغل گیر ہو گیا اور بولا ۔

"خدا نے جو میرا اور آپ کا رشتہ بنایا ہے وہ کبھی نہیں ٹوٹے گا ۔"

"اور بھی مضبوط ہو گا، رمضان چاچا ۔" شیل بھی ہم دونوں کے ساتھ لگ کر کھڑی ہو گئی ۔

باہر ہمارے مالک مکان کا لڑکا رام رتن کھڑا تھا ۔ وہ ہمارے مہمان کے لیے نیچے

سے ایک چارپائی اور بستر لے کر آیا تھا۔ اور اوپر آسمان پر دُوج کے چاند کی نرمل سی قاش، بادلوں کی جھری سے جھانک رہی تھی۔

رام رتن اور دُوج کے چاند کی قاش۔

نئی نسل کے دو نمائندے ہمارے اس پاک رشتے کی گواہی دے رہے تھے اور اُس کی سلامتی کا یقین دلا رہے تھے۔

پاک رشتوں کی سلامتی کا یقین بڑی تقویت دیتا ہے معصوم اور شریف انسانوں کو۔ اور ان کی پاسبانی بھی کرتا ہے۔

معصوم اور شریف لوگ ہی زندگی کی عظمت کے خاموش امانت دار ہیں!!!

یہ دو دن میں جمّوں سے سرینگر پہنچنے والا سلسلہ بڑا ٹیڑھا تھا۔ مسافر تو تھکن سے ٹوٹ جاتے تھے۔

مجھے یہ دیکھ کر حیرت اور خوشی بھی ہوئی کہ جب ہم سرینگر کے لال چوک والے بس اسٹینڈ پر پر پہنچے تو مبارک ہمارے استقبال کو کھڑا تھا۔

"ارے شادی والا لڑکا یہاں کھڑا ہے؟" میں نے اسے اپنی بانہوں میں لیتے ہوئے کہا۔

"خدمت تو خدمت ہی ہے حضور۔" پھر اس نے شیل کو سلام کیا اور ہمارا سامان بس کی چھت سے اُتروانے لگا۔

"ذُون کیسی ہے؟ چچا جان کیسے ہیں؟" شیل نے پُوچھا۔

"سب آنند میں ہیں۔" اس نے ہنستے ہوتے جواب دیا۔

"اور ذُون کی ماں؟" میں نے سوال کیا۔

"ان کی صحت کوئی بہت اچھی نہیں۔"

"کہاں لے چلو گے ہمارا سامان؟"

"آپ ہم دونوں کے مہمان ہیں۔ میرے بھی اور ذُون کے بھی۔"

"بے شک۔" شیل بولی۔

"اس بار آپ رہیں گے میرے ہاؤس بوٹ میں۔"

"تم نے ہاؤس بوٹ بھی لے لیا ہے؟"

"جی ہاں صاحب۔"

"کیوں شیل؟"

"ٹھیک ہے لیکن ہماری دیکھ بھال کون کرے گا؟"

"میرا چھوٹا بھائی راجہ۔ وہ بڑا ہوشیار لڑکا ہے آپا جی۔"

مبارک کا ہاؤس بوٹ بڑا بانکا تھا۔ بڑی لگن سے اس نے سنوارا تھا اُسے۔ راجہ وہاں موجود تھا اور اس نے سارے انتظامات پہلے ہی سے مکمل کر رکھے تھے۔

"میرا کام ختم حضور۔ آپ جن کے مہمان ہیں وہ تھوڑی دیر میں آپ کے پاس پہنچ جائیں گے۔ میں اب حاضر نہیں ہو سکوں گا۔"

"مگر کل تو ملو گے؟"

"ملے گا مگر دولہا کے روپ میں۔" میں نے قہقہہ لگایا۔

تھوڑی دیر بعد، ہمارے ساتھ چائے پی کر مبارک چلا گیا اور راجہ سے کہہ گیا کہ وہ اپنی ڈیوٹی پوری طرح سے نبھائے۔

شیل اور میں تھوڑی دیر سستانے کے لیے لیٹ گئے۔ بُری طرح سے تھک گئے تھے ہم لوگ۔ ابھی سورج غروب ہونے میں کچھ دیر تھی کہ رمضان جُو اور ذُون آ گئے۔ جس تپاک سے ذُون شیل سے ملی اس سے تو دیکھنے والے کو یہ وہم بھی ہو سکتا تھا کہ وہ دونوں سگی بہنیں تھیں اور بہت لمبے عرصے کے بعد ایک دوسرے سے مل رہی تھیں۔ رمضان جُو میرے پاس پلنگ پر ہی بیٹھ گیا۔

"آپ دونوں نے آکر جو میری حوصلہ افزائی کی ہے اس کا شکریہ ادا کرنے کے لیے میرے پاس الفاظ نہیں ہیں۔ آخر ہم ہیں تو ہانجی ہی۔"

"یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں رمضان صاحب آپ بہت بلند انسان ہیں۔" میں نے دیکھا رمضان جُو کی آنکھیں بھر آئی تھیں۔

"بھائی جان اگر آپ میری شادی میں نہیں آتے تو میں عمر بھر آپ سے نہ بولتی۔"

"مجھے اس بات کا پتہ تھا اسی لیے تو حاضر ہو گیا ہوں۔ البتہ جیسے تم اپنی بہت پیاری

آپا کہتی ہونا، وہ آنے کو تیار نہیں تھی۔ بڑی مشکل سے اُسے ساتھ لایا ہوں۔"

"کیوں جھوٹ بولتے ہو۔ ڈُون کو سب معلوم ہے۔ کیوں ڈُون؟" ڈون نے مسکرا کر سر ہلا دیا۔

"اس کے سر ہلانے کا مطلب تو یہ ہے کہ اسے میری بات سے اتفاق ہے۔ کیوں ڈُون؟" ڈُون نے مسکرا کر دوبارہ سر ہلا دیا۔

"اس کی بات پر سوائے اخبار والوں کے کوئی اعتبار نہیں کرتا۔"

"کوئی تو کرتا ہی ہے۔ تمہاری بات پر تو تمہاری اپنی بہن بھی نہیں کرتی۔ کیوں شِیل کی بہن؟" ڈُون اب کی بہت زور سے ہنسی۔

"بس اسی قسم کی باتیں مبارک اور ڈُون بھی کرتے ہیں۔" رمضان جُو نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"یہ حضرت تو سب کو بگاڑنے پر تُلے ہوتے ہیں۔" شِیل نے بظاہر ناراض ہوتے ہوئے کہا اور پھر ڈُون کو ساتھ لے کر ہاؤس بوٹ کی چھت پر چلی گئی۔

راجہ نے ہاؤس بوٹ کی بتّیاں جلا دی تھیں۔ وہ کچھ دیر رُک کر جانے لگا تو میں نے کہا۔

"تم تو گھر جاؤ راجے۔ گھر میں بہت کام ہو گا۔"

"آج زیادہ کام نہیں ہے صاحب۔ آپ کو کھانا کھِلا کر چلا جاؤں گا۔"

"بہت اچھا بچّہ ہے۔" رمضان جُو نے اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"میرے لیے کوئی خدمت بتاؤ، رمضان صاحب۔"

"آج مہندی کی رات ہے۔ شادی ہم زینہ کدل والے آبائی مکان میں کر رہے ہیں۔ وہیں آنا ہے آپ دونوں کو۔ کھانا بھی وہیں ہو گا۔"

"جو آپ کا حکم ہے رمضان صاحب۔ ہم تو آئے ہی اسی لیے ہیں۔ راجہ کو کہہ دیجیے وہ کھانا نہ بنائے۔"

"کہہ دوں گا بلکہ اسے کہوں گا کہ وہی آپ دونوں کو ہمارے گھر لے آئے۔ آپ کے کئی دوست بھی آپ کو وہیں ملیں گے۔"

"بشیر احمد کو کہلوا دیا ہے آپ نے؟"

"جی ہاں۔"

"تو اب آپ جائیے اور اپنے مہمانوں کی خاطرداری کیجیے۔"

اتنے میں شِیل اور ڈُون بھی چھت سے نیچے آ گئیں۔ شِیل نے ایک چھوٹا سا اٹیچی کیس ڈُون کے

حوالے کر دیا، جس میں اس کے لیے لائی ہوئی چیزیں رکھی تھیں۔ خاص طور پر میک اپ کا سامان۔
"جلدی سے آجانا آپا۔ آپ ہی آکر تیار کریں گی مجھے۔" ذُون نے اٹیچی کیس کو سنبھالتے ہوتے
اور ہاؤس بوٹ سے باہر نکلتے ہوئے کہا۔ "بھائی جان آپ بھی جلدی سے تیار ہو جائیے۔"
ذُون نے مجھے اس طرح کہا جیسے وہ واقعی میری بہن ہو اور اسے یہ حق ہو کہ وہ مجھ سے
اس طرح سے بات کرے۔ انسانی رشتوں کا یہ انداز بڑا عجیب ہے۔ کبھی کبھی آپ کے سگے سمبندھی
آپ سے ذہنی طور پر میلوں دُور ہوتے ہیں اور کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ جس سے آپ کا کوئی رشتہ نہیں
ہوتا وہ آپ کی رگِ جاں سے بھی قریب ہو جاتا ہے۔

رشیل نے جس پیار اور لگن سے ذُون کو تیار کیا تھا، اس کا تو کوئی اندازہ ہی نہیں لگا سکتا۔ رشیل
تو کشمیری عورتوں کی ہیروئین بن گئی تھی ہر طرف اس کے چرچے تھے۔ عورتیں کہہ رہی تھیں کہ اس کے ہاتھ
میں جادُو ہے اور وہ کسی کو بھی کچھ سے کچھ بنا سکتی تھی۔ اب تو وہ سوچ رہی تھیں کہ اگلے دن جب
ذُون کا نکاح ہوا تو رشیل اُسے تو سچ مچ پری بنا ڈالے گی۔ مبارک ذُون کو تھوڑی بیاہنے آئے گا۔
وہ تو آسمان سے اُتری ایک حُور کو لے جاتے گا اپنے ساتھ۔

رمضان جُو اور اس کی بیوی بے حد خوش تھے۔ ہمارے آجانے سے وہ پھُولے نہ سمارہے
تھے۔ ذُون کی ماں نے سرخ رنگ کا فرن پہن رکھا تھا جس سے اس کے گورے چہرے کے
تیکھے نقش اور بھی اُبھر آتے تھے۔ مجھ سے ملنے پر وہ اسی طرح شرما گئی، جس طرح وہ پہلی بار
شرمائی تھی، جب ہم اس کے ڈونگے میں چاتے پینے گئے تھے۔ باوجود اپنے پیارے تیکھے نقوش
اور گورے رنگ کے وہ بہت کمزور لگ رہی تھی۔

بشیر احمد اور اس کے کچھ ساتھی بھی آگئے تھے مجھ سے ملنے۔ ہم مکان سے باہر گلی میں کھڑے
باتیں کرنے لگے۔

"آپ نے اچھا کیا آگئے۔ کچھ ہی روز میں نیشنل کانفرنس کا سالانہ اجلاس ہو رہا ہے۔"

"کہاں ہو رہا ہے اجلاس؟"

"شاید سوپور میں۔ کل فیصلہ ہو جاتے گا۔"

"اور کیا خبریں ہیں؟"

"ان ہی دنوں ہمارے کچھ قومی رہنما جو جیلوں سے رہا ہوتے ہیں، سرینگر آنے والے ہیں۔
ان کے استقبال کا بڑا شاندار پروگرام مرتب کیا جا رہا ہے۔"

"لگتا ہے کہ اب جموّں میں کسی کی دلچسپی نہیں ۔"

"مجھے بھی ایسا ہی لگتا ہے ۔ بہر حال جموّں، ریاسی، راجوری، اُودھم پور، سبھی جگہوں سے نمائندوں کو بلوایا گیا ہے ۔"

"پر مجھے تو کوئی دعوت نامہ نہیں ملا ۔"

"بس کل بھیجے جار ہے ہیں دعوت نامے ۔ تمہارا اور شیل جی کا دعوت نامہ یہیں دے دوں گا ۔"

"تو کتنے دن رہنا پڑے گا یہاں ؟"

"ہفتہ دس دن تو رہنا ہی پڑے گا ۔"

"لیکن یار یہ تو بڑا عجیب لگے گا ۔ ڈون کی شادی تو کل ہو جاتے گی ۔ زیادہ سے زیادہ ایک آدھ دن اور رُکا جا سکتا ہے ۔"

"مبارک سے میری بات ہو چکی ہے ۔ آپ لوگ دس روز سے پہلے جا ہی نہیں سکتے ۔"

"ہوشیار آدمی ہو ۔" میں نے ہنستے ہوتے کہا ۔

"ہوشیار تو ہم دونوں ہی نہیں ہیں ۔ بس دوستی نبھار ہے ہیں ایک دوسرے سے ۔"

"ٹھیک ہی کہہ رہے ہو تم ۔"

بشیر احمد کے ملنے والے کچھ اور لوگ آ گئے ہماری مزید گفتگو نہ ہو سکی ۔ گلی میں مکان کے اندر سے عورتوں کے گانے کی بڑی خوبصورت آواز آرہی تھی ۔ کئی عورتیں مہندی کی رات کا گانا گا رہی تھیں ۔ بشیر احمد نے مجھے کشمیری گیت کا ترجمہ کر کے سنایا ۔

ہم سب تمہیں مہندی کی رات پر مبارک باد دیتی ہیں ۔

تمہیں خدا نے اپنی برکتوں سے نوازا ہے ۔

خدا کرے تمہیں زندگی میں کوئی خطرہ اور حادثہ پیش نہ آتے ۔

خدا تمہارا نگہبان ہو ۔

تم اپنی خوبصورتی میں لامثال ہو ۔

خدا نے تمہیں اپنی برکتوں اور رحمتوں سے نوازا ہے !!

اور پھر نسوانی قہقہوں کی مترنم گونجیں زینہ کدل کی اس گلی کی فضا میں نغمہ ریز ہو گئیں ۔

میں تو واپس اپنے ہاؤس بوٹ میں آگیا لیکن شیل رات کو زینہ کدل ہی میں رُک گئی ۔ ڈون

نے اسے میرے ساتھ نہیں آنے دیا۔ میں نے کھڑکی میں کھڑے ہو کر آسمان کی طرف دیکھا۔ آج بھی ویسا ہی چاند آسمان کی وسعتوں میں چمک رہا تھا، جو اُس رات چمکا تھا جب میں شیل کو لے کر پہلی بار سرینگر آیا تھا اور ہم رمضان جو کے ہاؤس بوٹ میں ٹھہرے تھے۔

اُس رات شیل اور میں دونوں کھڑکی میں کھڑے تھے۔

آج میں اکیلا تھا اور مجھے یوں اکیلا ہو جانا بہت اکھر رہا تھا۔ میں بہت دیر اکیلا کھڑا رہا اور ہلکی ہلکی چاندنی کو فضا میں بکھرتے ہوتے دیکھتا رہا۔ مجھے لگا جیسے آج کی رات یہ چاندنی ہی میری رفیق تھی اور یہی رفیق رات بھر مجھ سے گفتگو کرتی رہے گی اور مجھے وہ داستانیں سناتی رہے گی جو صرف چاندنی ہی سنا سکتی ہے۔ اُداس اور غمزدہ کر دینے والی داستانیں!

اگلی صبح میں ناشتے سے فارغ ہوا ہی تھا کہ بشیر احمد آ گیا۔ اس کے ساتھ ایک مولوی قسم کا بزرگ بھی تھا، جسے میں نہیں جانتا تھا۔

"یہ مولوی نورالدین ہیں، زینہ کدل ہی میں رہتے ہیں اور نیشنل کانفرنس کے بڑے محرک ورکر ہیں۔ کشمیر کی تاریخ کے بارے میں بھی ان کی معلومات بہت ہیں۔"

میں نے مولوی نورالدین سے ہاتھ ملایا اور اسے بیٹھنے کے لیے کہا۔ چائے کے لیے پوچھا، دونوں ناشتہ کر کے آتے تھے۔ اس لیے چائے کی ضرورت نہیں تھی۔

"میں نیشنل کانفرنس کے سالانہ اجلاس کے دعوت نامے لایا ہوں۔ آپ کے لیے اور شیل صاحبہ کے لیے۔ باقی دعوت نامے آج ڈاک سے چلے جائیں گے۔"

"کہاں کر رہے ہیں سالانہ اجلاس؟"

"سوپور میں کریں گے۔ وہاں کے ورکرز بہت دنوں سے تقاضا کر رہے ہیں۔"

"آپ کی چونکہ گہری نظر ہے کشمیر کی تاریخ پر، مجھے دریائے جہلم پر بنے پُلوں کی تاریخی حیثیت کے بارے میں تو کچھ بتائیے۔ پہلے امیرا کدل پُل کے بارے ہی میں بتائیے۔"

"کشمیر کی تاریخ تو بڑی پرانی لیکن بڑی متنوع رہی ہے۔ یہاں ہندو، مسلمان، مغل، پٹھان، سکھ حکمران حکمرانی کرتے رہے ہیں۔ ۱۸۴۶ء میں راجہ گلاب سنگھ نے پچھتر لاکھ روپے میں ایک معاہدہ کی رو سے کشمیر اور تمام پہاڑی علاقہ سکھ حکمرانوں سے خرید لیا تھا۔"

"یہ میں جانتا ہوں۔"

"جہلم دریا کے ساتوں پُل کسی نہ کسی حکمران یا اس کے عہد سے وابستہ ہیں۔ پٹھانوں کے

عہد میں ایک پٹھان حکمراں امیر خاں جوان شیر تھا۔ اسی نے امیران کدل کا پُل بنوایا تھا جو بعد میں امیراکدل کے نام سے مشہور رہوا۔ اسی پٹھان حکمران نے شیر گڑھی کا محل بھی بنوایا تھا جسے ڈوگرہ راجے بھی استعمال کرتے رہے۔ صرف آخری مہاراجہ ہری سنگھ نے اسے استعمال نہیں کیا تھا۔"

اور حبّہ کدل کا پُل ؟"

"یہ حبّہ خاتون کی شخصیت سے وابستہ ہے۔ جس کے بارے میں تو آپ جانتے ہی ہوں گے۔"

"اور زینہ کدل جہاں رمضان جُو کا مکان ہے اور جہاں ہمیں رات کو بارات کا استقبال کرنا ہے اور جس علاقے میں آپ رہتے ہیں۔"

"یہ چوتھا پُل ہے۔ اسے سلطان زین العابدین نے بنوایا تھا۔ اس بادشاہ نے کئی نہریں بھی بنوائی تھیں۔ ایک مشہور نہر نالا مار ہے جو سری نگر کو جھیل ڈل سے ملاتی ہے۔ اس نے بہت سی عمارتوں کی بھی تعمیر کرائی۔ اس بادشاہ کو بڈشاہ بھی کہتے ہیں۔"

"مولوی صاحب مجھے زین العابدین کے بارے میں کچھ اور بھی معلومات دیجئے۔"

"زین العابدین سلطان سکندر کا بیٹا تھا۔ سکندر جب تخت نشین ہوا تو اس کی عمر صرف آٹھ برس کی تھی۔ اس کی ماں صورہ بیگم بارہ سال تک سکندر کی جگہ حکومت کرتی رہی۔ وہ اتنی سخت قسم کی عورت تھی کہ جب اسے یہ معلوم ہوا کہ اس کی بیٹی اور داماد نابالغ سلطان کے خلاف بغاوت پر تُلے ہوئے تھے تو اس نے دونوں کو مروا دیا۔ سلطان سکندر کو تو سکندر بُت شکن کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اس نے ہندوؤں کے مندر مسمار کر دیے اور ان کی مذہبی کتابیں جھیل ڈل میں پھنکوا دیں۔ کہا جاتا ہے کہ اس نے سال بھر ایک سو آدمیوں کو مارتنڈ کے عظیم مندروں کو مسمار کرنے کے کام پر لگائے رکھا۔ کشمیری ہندو، وادی کو چھوڑ کر جانے پر مجبور ہو گئے۔ تیئس ۲۳ سال کی اس کی حکومت کو سب سے تاریک حکومت سمجھا جاتا ہے۔"

"لیکن اس نے ایسا کیوں کیا مولوی صاحب ؟"

"اتنا تو مجھے معلوم نہیں۔ میرا خیال ہے کہ سکندر پر اس کی ماں کا اثر ہوگا جو ایک بہت ہی جابر قسم کی عورت تھی۔ لیکن جب اس کا بیٹا زین العابدین سترہ برس کی عمر میں تخت نشین ہوا تو حالات ایکدم ہی بدل گئے۔ سلطان زین العابدین کی حکومت کو سری نگر کی وادی کا سنہری دور کہا جاتا ہے۔ اس نے جہاں مسمار شدہ مندروں کو دوبارہ تعمیر کروایا وہاں وادی کو چھوڑ کر چلے گئے کشمیری پنڈتوں کو بھی واپس بُلایا اور انھیں بہت سی مراعات دیں۔

زین العابدین اسکالروں کی بڑی عزت کرتا تھا۔ کشمیری زبان کے علاوہ اسے سنسکرت اور فارسی اور تبتی زبانوں پر بھی عبور حاصل تھا۔ وہ خود بھی شاعر تھا اور قطب کے تخلص سے شاعری کرتا تھا۔ اس کے دربار میں بہت سے مقامی اور غیر مقامی عالم و فاضل موجود تھے۔ اس کے دربار کے مورخ جوناراج نے سنسکرت میں کشمیر کی تاریخ نظم کی جو راج ترنگی کے زمانے کے بعد کی تاریخ ہے۔ جوناراج کی موت کے بعد اس کام کو سری وار نے جاری رکھا۔ یوتھوسوا پنڈت نے کشمیری زبان میں "زینہ چیرت" کی تخلیق کی جس میں سلطان کے کارناموں کا ذکر ہے۔ ایک اور درباری یودھا بٹ نے سلطان کی کشمیری میں سوانح عمری لکھی جس کا عنوان "زینہ پرکاش" ہے۔ مُلا احمد اور مُلا نادری دونوں مورخوں نے فارسی میں کشمیر کی تاریخ مرتب کی۔"

"مولوی صاحب، سلطان زین العابدین کی زندگی کا کوئی اہم واقعہ سنا سکتے ہیں؟"

"واقعات تو کئی ہیں لیکن ایک اہم واقعہ سناتا ہوں۔ اس واقعہ نے سلطان کو بیحد متاثر کیا۔"

"سُنائیے۔"

"زین العابدین کے تخت نشین ہونے کے تھوڑے ہی عرصہ بعد اس کے بدن پر ایک بہت تکلیف دہ پھوڑا نکل آیا۔ درد برداشت سے باہر تھا۔ مُسلم شاہی حکیموں کی ہزار کوشش کے بعد کوئی افاقہ نہ ہُوا اور سلطان کی حالت دن بدن بگڑنے لگی۔ کسی ہندو حکیم کی تلاش کی گئی جو سلطان کا علاج کر سکے۔ خوش قسمتی سے ایک ہندو حکیم شوکھبٹ ملا جو علاج کرنے کے لیے تیار ہو گیا۔ اس نے ایک سنہری رنگ کا مرہم استعمال کیا اور بغیر درد کے اس پھوڑے کو جسم سے الگ کر دیا۔ سُلطان بہت خوش ہوا اور اس نے حکیم شوکھبٹ سے کہا کہ وہ جو کچھ بھی مانگے گا سُلطان اُسے خوشی سے دے گا۔ شوکھبٹ نے اپنے لیے کچھ نہیں مانگا۔ اس نے سُلطان سے صرف یہ درخواست کی کہ کشمیر کی وادی میں ہندوؤں کو امن اور چین سے رہنے دیا جاتے اور اُن کے جان و مال کی حفاظت کی جاتے۔ بیدار مغز سُلطان شوکھبٹ کی اس بات سے اور بھی زیادہ خوش ہوا اور اس کی درخواست قبول کر لی۔ اس ایک واقعہ نے زین العابدین کو ہندوؤں میں اتنا ہر دلعزیز بنا دیا کہ وہ اسے بڈشاہ کے نام سے پکارنے لگے۔ بڈشاہ یعنی عظیم بادشاہ۔ آج تک کشمیری لوگ زین العابدین کو بڈشاہ ہی کے نام سے یاد کرتے ہیں۔"

"بہت اچھا واقعہ سنایا آپ نے۔ کہا جاتا ہے کہ زین العابدین نے وُلر جھیل میں

ایک عمارت زین لنکا کے نام سے بنوائی تھی۔ یہ عمارت کیا تھی؟" میں نے سوال کیا۔

"ڈلر جھیل کے درمیان کسی زمانے میں ایک چھوٹا سا جزیرہ تھا جو بعد میں کسی وقت پانی میں غرق ہو گیا تھا۔ سلطان نے یہ فیصلہ کیا کہ اس جزیرے کو پھر سے اُبھارا جائے۔ چنانچہ پتھروں سے بھرے چھکڑوں کے چھکڑے اس جگہ، جہاں جزیرہ ہوا کرتا تھا، خالی کیے جانے لگے حتیٰ کہ زمین کی سطح پانی کی سطح سے اُوپر اُٹھ آئی۔ اس جزیرے پر سلطان نے ایک محل، ایک مسجد اور ایک باغ بنوایا۔ یہ محل چار منزلہ تھا۔ ہر منزل میں مختلف میٹریل استعمال کیا گیا تھا۔ پہلی منزل پتھروں سے بنی تھی، دوسری اینٹوں سے اور تیسری اور چوتھی میں لکڑی استعمال کی گئی تھی۔ لیکن مسجد کی تعمیر میں صرف پتھر ہی استعمال کیے گئے تھے۔

جب آپ کانفرنس کے اجلاس میں سوپور چلیں گے تو میں آپ کو سوپور سے گزر کر، ڈٹلب گاؤں سے ہوتے ہوتے، اُس اونچی پہاڑی پر لے چلوں گا جہاں سے زین لنکا کے کچھ کچھ آثار اب بھی نظر آتے ہیں۔ ڈل جھیل میں آپ سون لنکا اور رُوپا لنکا کے آثار تو دیکھ ہی چکے ہوں گے۔ دراصل سلطان زین العابدین کو تعمیرات کا بہت شوق تھا۔"

"اب چھوڑو یار تم تو تاریخ کی ہی ورق گردانی کرنے لگے۔" بشیر احمد جو اب تک خاموش تھا اب خاموش نہ رہ سکا۔

"میری تاریخ میں بڑی دلچسپی ہے۔ اس لیے یہ سب جاننے کی خواہش تھی۔ اب اس سلسلے میں کوئی بات نہ ہوگی۔"

ہم گفتگو کے اس موڑ پر پہنچے تھے کہ شیل راجہ کے ساتھ آگئی۔ بہت تھکی ہوئی لگ رہی تھی۔ جیسے رات بھر جاگتی رہی ہو۔ مہندی کی رات تو ہوتی بھی جاگنے کے لیے ہی ہے سوتا کون ہے اُس رات۔ اُس رات تو چاند اور تارے بھی جاگتے رہتے ہیں۔

"اب آپ اپنی مجلس ختم کیجیے۔ میں سونا چاہتی ہوں۔"

"سوئیے حضور لیکن مولوی نورالدین تمہارے لیے نیشنل کانفرنس کے اجلاس کا دعوت نامہ لائے تھے۔" میں نے دعوت نامہ اس کی طرف بڑھا دیا۔

"بہت بہت شکریہ، مولوی صاحب۔"

"تشریف ضرور لائیے گا اجلاس میں۔"

"ہم لوگ تو بشیر بھائی کے پیرو کار ہیں جہاں لے جائیں گے، چل پڑیں گے۔"

"میں ساتھ لے چلوں گا آپ کو مطمئن رہیے۔" بشیر احمد نے جواب دیا۔
تھوڑی دیر کے بعد بشیر احمد اور مولوی نورالدین چلے گئے۔ اُن سے شام کو زینہ کدل میں برات کے آنے پر ملاقات ہو گی۔
شیل تو بستر پر گرتے ہی گہری نیند سو گئی۔ پھر مجھے بھی نیند آگئی۔ کوئی چار بجے کے قریب راجہ نے جگایا اور کہا کہ ہم لوگ چائے پی لیں کیونکہ پھر اُسے گھر جانا تھا اور برات میں شامل ہونے کی تیاری کرنی تھی۔
شیل تو راجہ کے ساتھ ہی چلی گئی۔ راجہ کو علی کدل جانا تھا۔ زینہ کدل سے ایک ہی پل آگے۔ اس لیے وہ اس کے ساتھ زینہ کدل تک جا سکتا تھا۔ شیل کے ذمے دُون کو تیار کرنا بھی تھا۔ اُس کی بہت سی سہیلیوں کا بھی تقاضا تھا کہ شیل انھیں بھی تیار کرے۔ شیل تو یوں سمجھیے کہ ایک ہی دن میں اس سارے محلّے کی لڑکیوں اور جوان عورتوں کی لیڈر بن گئی تھی۔ میں تو خیر دیر سے پہنچا تھا لیکن میرے پہنچنے تک تو شیل نے محلے کی ہر جوان لڑکی کو حُور بنا ڈالا تھا۔ دُون کے چہرے پر تو نگاہ نہ ٹکتی تھی۔
برات آئی تو رمضان جُو نے مجھے مبارک کے والد سے یہ کہہ کر ملوایا کہ میں اس کا بیٹا تھا اور شادی کے سارے انتظامات میں نے ہی کیے تھے۔ مبارک کا والد بڑی محبت سے مجھے ملا اور اس نے بتایا کہ مبارک اسے میرے بارے میں پہلے ہی بہت کچھ بتا چکا تھا۔ مولوی نورالدین سے بھی دوبارہ ملاقات ہوئی۔ زینہ کدل میں لوگ اس کا احترام کرتے تھے۔ مبارک بھی کچھ کم خوبصورت نہیں لگ رہا تھا لیکن سب سے بانکا تو لگ رہا تھا اس کا چھوٹا بھائی راجہ۔ اُدھر رمضان جُو کے گھر کے باہر خوبصورت عورتوں کا پورا ہجوم تھا۔
"اتنی خوبصورت عورتیں کہاں سے اُٹھا لاتے ہو؟" میں نے اکیلے میں رمضان جُو سے سوال کیا۔
"یہ سب شیل کی کرامات ہے۔"
"اچھا۔"
"عورتیں اب اسے زینہ کدل سے جانے نہیں دیں گی۔"
"میں تو خوش ہوں گا۔"
"کیوں؟"

"میری جان چھوٹے گی اس سے۔"

"سچ کہہ رہے ہو؟"

"میں سچ بولتا ہی کب ہوں۔ رشیل کی میرے متعلق یہی تو راتے ہے۔" ہم دونوں ہنس دیے۔

برات کا استقبال کرنے والوں اور ان کی خاطر داری کرنے والوں میں کشمیری پنڈتوں کی تعداد کم نہیں تھی بلکہ مسلمانوں کے برابر ہی تھی۔

عورتوں میں بھی کشمیری پنڈتوں کے گھروں کی عورتوں کی تعداد کافی تھی۔ برات میں شامل براتیوں میں بھی کشمیری پنڈت بہت تھے۔ بلکہ دو تین سکھ بھی برات میں شامل تھے، جو بارہ مولہ اور سوپور سے آتے تھے اور برات کی آمد پر جو عورتیں گیت گا رہی تھیں ان میں ہندو عورتوں کی تعداد زیادہ تھی۔ مجھے یہ منظر دیکھ کر بے حد خوشی ہوئی۔ جموں میں بھی کچھ اسی قسم کا رواج تھا۔ مجھے اپنے آپ پر فخر محسوس ہوا کہ میں ہندوستان کے اس علاقے کا رہنے والا تھا۔ جہاں مختلف قوموں اور مذہبوں کے لوگ اس محبت اور رواداری سے رہتے تھے اور اپنی روشن روایات کی پاسداری کرتے تھے۔

برات کی خاطر داری ہونے لگی تھی۔ رمضان جو نے پورے 'وازوان' کا انتظام کر رکھا تھا۔ ساری گلی روشنی سے جگمگا اٹھی تھی۔ براتی بھی بہت خوش تھے۔ سب سے زیادہ خوش تو راجہ تھا جو ایک بار مکان کے اندر جا کر ڈون سے بھی مل آیا تھا اور اپنے گورے گورے گال پر رشیل کی ہلکی سی چپت بھی کھا آیا تھا۔

"تم کیا کرنے آتے ہو اندر؟" رشیل نے پیار بھرے انداز سے ڈانٹا بھی تھا اُسے۔

"شاید کوئی لڑکی مجھے بھی پسند کر لے۔"

"بے شرم کہیں کا۔ بھاگ جاؤ۔"

"لیجئے بھاگ جاتا ہوں۔"

راجہ بھاگ کر گلی میں آگیا اور مجھے تمام قصہ سنایا۔ میں اور مولوی نورالدین اور بشیر احمد خوب زور سے ہنسے۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ کئی رشتے اس طرح ہی طے ہو جاتے ہیں۔ لڑکا برات میں گیا اور وہیں کسی نے پسند کر لیا۔ خدا بڑا کارساز ہے۔

نکاح کے بعد میں تو بشیر احمد کے ساتھ آگیا لیکن رشیل آج بھی ڈون کے گھر میں ہی رُک گئی تھی۔ دونوں ایکدوسرے سے کتنا پیار کرتی تھیں!

اگلے روز بشیر احمد مجھے شاہ ہمدان کی زیارت، سلطان زین العابدین اور اس کی ماں کی قبریں۔ جامع مسجد، دلاور خاں کا باغ، بلبل لنکار مسجد، علی مسجد، دکھاتے ہوئے دریا کے کنارے اس جگہ پر لے آیا جس کے سامنے دریا کے کنارے پر نور باغ کے کھنڈرات تھے۔ یہ وہ جگہ تھی جہاں مجرموں کو پھانسی لگائی جاتی تھی۔ اس جگہ کو لوگ آج بھی خوف سے یاد کرتے ہیں حالانکہ کئی صدیوں سے یہاں کسی کو پھانسی پر نہیں چڑھایا گیا۔ بشیر احمد مجھے گھماتے گھماتے صفا کدل تک لے گیا، جو شہر کا آخری پُل ہے۔ میں سرینگر کے اندرونی حصوں میں کبھی نہیں آیا تھا یہاں کی زندگی دیکھ کر مجھے اس مخلوط تہذیب اور کلچر کی زندہ مثال ملی، جس کا ذکر ہم اپنی تقریروں یا تحریروں میں ہی کرتے ہیں۔ ہندو اور مسلمانوں کے ساتھ ساتھ جڑے ہوئے لکڑی کے گھر۔ دریا کے گھاٹ پر ہندوؤں اور مسلمانوں کی ساتھ ساتھ لگی عبادت گاہیں۔ دونوں مذہبوں کے ایک جیسے نام، ایک جیسے رسم ورواج۔ مجھے احساس ہوا کہ اگر قومی اور مذہبی آہنگی کی حقیقی تصویر دیکھنی ہو تو آپ دریائے جہلم کے ساتوں پُلوں کے آر پار رہنے والے عوام کو دیکھیں اور محسوس کریں کہ کشمیر کی وادی اپنی بے مثال روایات کو آج بھی کس شان سے سنبھالے ہوتے ہے۔

دو دن کے بعد مجھے وہ منظر دیکھنے کو ملا جس کے بارے میں مَیں نے اپنے والد سے سُن تو رکھا تھا لیکن کبھی دیکھا نہیں تھا۔ وہ تھا دریائی جلوس۔ اس کی شروعات تو سلطان زین العابدین کے زمانے سے ہوئی تھی۔ وادی کشمیر کے سلطان اور مہاراجے خاص خاص موقعوں پر اپنے مہمانوں اور پُر وقار شہریوں کے ساتھ، دریائے جہلم میں خوبصورت اور سجی ہوئی کشتیوں میں بیٹھ کر، جلوس کی شکل میں نکلتے تھے۔ مہاراجہ رنبیر سنگھ اور پرتاپ سنگھ اور ہری سنگھ کے زمانے میں تو ایسے جلوس اکثر نکلتے رہے تھے۔ میرے والد نے خود بھی ایسے جلوسوں میں شرکت کی تھی لیکن مجھے ایسے جلوس دیکھنے کا کبھی موقع نہیں ملا تھا۔

ہمارے قومی رہنماؤں کو جنھیں برٹش سرکار نے "ہندوستان چھوڑو تحریک" کے دوران گرفتار کیا تھا اور ہندوستان کی مختلف جیلوں میں قید رکھا تھا، کچھ سیاسی مصلحتوں کی بنا پر رہا کر دیا تھا۔ اُن میں سے بہت سے لیڈروں نے قید کی صعوبتوں کے بعد یہی مناسب سمجھا کہ وہ کچھ دن کشمیر کی حسین وادی میں جا کر تھوڑی دیر آرام کریں۔ مولوی نور الدین نے بتایا کہ پنڈت نہرو، مولانا ابوالکلام آزاد، خان عبدالغفار خان، عبدالصمد خاں اچکزئی، میاں افتخار الدین اور آصف علی تو آ بھی چکے تھے اور نیشنل کانفرنس، شیخ صاحب کی سربراہی میں ان کا استقبال کرنے کے

لیے ۔ان سب کا دریائے جہلم میں دریائی جلوس نکالنے کے لیے تیاری کررہی تھی ۔مولوی نورالدین نے کہاکہ میں اس جلوس میں جموں کی نمائندگی کروں گااو نیشنل کانفرنس کے کچھ ورکرز کے ساتھ ایک کشتی میں بیٹھوں گا، نیشنل عورتوں کی نمائندگی کرے گی اور وہ بھی ہمارے ساتھ جلوس میں شامل ہوگی ۔میں نے مولوی نورالدین اور بشیر احمد کی اس مشترکہ پیش کش کے لیے ان کا شکریہ ادا کیا۔ دریائی جلوس میں استعمال ہونے والی یہ کشتیاں خاص قسم کی ہوتی ہیں اور انھیں 'پرندے' کہتے ہیں ۔

بس ایک دن بعد قومی رہنماؤں کا دریائی جلوس نکلا۔ بہت ہی شاندار طریقے سے سجے ایک "پرندے" میں قومی رہنماؤں کے ساتھ شیخ عبداللہ بیٹھے تھے۔ ساتھ میں کئی اور 'پرندے' تھے جن میں کشمیری لوک گیت گانے والی ٹولیاں بیٹھی تھیں۔ پرندوں کی پچھلی قطاروں میں نیشنل کانفرنس کے ممتاز کارکن اور ریاست کے مختلف علاقوں کی نمائندگی کرنے والے ورکرز تھے ۔جواہرلال نہرو زندہ باد، خان عبدالغفار خاں زندہ باد، مولانا ابوالکلام آزاد زندہ باد کے نعرے گونج رہے تھے۔ جہلم کے دونوں کناروں کے ساتھ ساتھ کھڑے تھے ہاؤس بوٹ اور شکارے، جن پر رنگ برنگی کپڑے، جھنڈے اور قالین سجے تھے۔ دریا کے دونوں کناروں کے مکان بھی اسی طرح آراستہ تھے اور کناروں پر عورتوں، مردوں اور بچوں کی بھیڑ تھی، جو رنگدار کپڑے پہنے کھڑے تھے اور رہنماؤں کے استقبال میں نعرے لگا رہے تھے۔ یہ منظر واقعی دلفریب تھا اور میں آج تک اس منظر کو نہیں دیکھ پایا تھا۔ اچھی چیزوں کو دیکھنا، اچھے لوگوں کی قربت حاصل کرنا اور اچھی محفلوں میں شریک ہونا یہ سب توفیق کی بات ہے اور ہر کسی کو خدا یہ توفیق نہیں دیتا! جیلوں سے رہا ہوتے قومی رہنماؤں کے لیے یہ واقعی ایک ناقابل فراموش واقعہ تھا۔ اس دریائی جلوس کا سارا انتظام بخشی غلام محمد کے ذمے تھا جو نیشنل کانفرنس کے والنٹیر کور کا سالار تھا۔ شام کو حضوری باغ میں ایک بہت بڑا جلسہ تھا۔

شیخ عبداللہ نے قومی رہنماؤں کے استقبال میں ایک بڑی ہی موثر اور جامع تقریر کی۔ جلسے کی صدارت مولانا ابوالکلام آزاد کر رہے تھے جو اس وقت انڈین نیشنل کانگریس کے صدر تھے۔ مولانا کی صحت احمد نگر کے قلعے کی اسیری نے برباد کر ڈالی تھی۔ انھیں اس بات کا بے حد صدمہ تھا کہ وہ اپنی شریک حیات زلیخا بیگم کو اس کی زندگی کے آخری لمحوں میں بھی نہیں دیکھ سکے تھے۔ برٹش سرکار نے انھیں یہ اجازت بھی نہیں دی تھی، وہ جلسے میں بہت کم بولے تو وہ بیحد کمزور اور مایوس لگ رہے تھے۔ انھوں نے کہا کہ وہ وادی میں اپنی

صحت کو بحال کرنے آتے تھے اور چاہتے تھے کہ کچھ روز سکون سے رہ سکیں۔ البتہ انھوں نے شیخ عبداللہ کی بہت تعریف کی۔ پنڈت نہرو نے بھی شیخ صاحب کی بہت تعریف کی اور کہا کہ کشمیری عوام کو ان کی قیادت پر فخر کرنا چاہیئے۔ اپنے کشمیری ہونے پر فخر کرتے ہوتے انھوں نے کہا "میرا ذکر مہمان کے طور پر ہوا ہے حالانکہ مجھے کشمیری ہونے کا فخر حاصل ہے۔ کشمیریت میرے خون میں، میرے رگ و ریشے میں اور میرے دل و دماغ میں رچی بسی ہے۔"

خان عبدالغفار نے بھی جلسے میں تقریر کی۔ انھیں میں نے پہلی بار دیکھا تھا۔ وہ واقعی بڑی پُر وقار شخصیت کے مالک تھے۔

مبارک، ڈُون اور رمضان جُو سے تو روز ہی ملاقات ہوتی تھی۔ رمضان جُو تو بلکہ دن بھر میرے ہی ساتھ رہتا تھا۔ شیل کا زیادہ وقت ڈُون کے ساتھ ہی گزرتا تھا۔ اُس نے تو جیسے زینہ کدل اور علی کدل کو ہی اپنا گھر بنا لیا تھا۔ زینہ کدل کی عورتوں سے فارغ ہوتی تو اپنا اڈہ علی کدل میں جما لیتی۔ ایک شام جب وہ بڑی تھکی ہوئی سی لَوٹی تو میں نے کہا۔

"تمہارا یہیں رہ جانے کا تو ارادہ نہیں ہے؟"

"سوچ تو یہی رہی ہوں۔"

"تو طلاق کا معاملہ شروع کیا جاتے؟"

"خدا کی قسم کر دو۔ اگر ایک اخبار والے اور دِی سو کالڈ لیڈر کے ساتھ ہی زندگی بسر کرنی ہے تو یہاں تم سے ہزار درجہ بہتر آدمی مل جاتے گا۔"

"تو دو ایک دن میں یہ کام بھی کر ڈالو۔ تمہاری شادی میں شامل ہونے کے بعد ہی جموّں واپس جاؤں گا۔"

"شرم نہیں آتی ایسی باتیں کرتے ہوتے۔"

یہ کہہ کر شیل نے مجھے اپنی بانہوں میں لے لیا اور میرے چہرے کو لگاتار چُومنے لگی۔

اگلے روز سوپور میں نیشنل کانفرنس کا سالانہ اجلاس ہوا، جس میں سبھی قومی رہنماؤں نے شرکت کی اور تقریریں بھی کیں۔ سوپور کے ورکرز نے واقعی بڑی محنت کی تھی اجلاس کو کامیاب بنانے میں۔ شیل نے تو سبھی قومی لیڈروں کے آٹوگراف لیے۔ شیخ صاحب کے بھی۔ بلکہ مولوی نورالدین نے پنڈت نہرو، مولانا آزاد اور خان عبدالغفار خان کے ساتھ شیل کی تصویریں بھی کھنچوا دیں۔ شیل بہت خوش تھی۔ شیخ صاحب سے بھی میری گفتگو ہوئی۔ اُس وقت تو

وہ اپنی زندگی کی آخری بلندی پر نظر آ رہے تھے۔

اجلاس کے بعد شبل اور میں بشیر احمد اور مولوی نورالدین کے ساتھ وٹلب گاؤں سے گزر کر اس پہاڑی پر پہنچے جہاں سے وُلر جھیل کی پوری وسعت نظر آرہی تھی اور پہاڑی کی دوسری چوٹی پر ایک بہت پہنچے ہوئے فقیر شکرالدین کا مزار تھا، جس کو لوگ بہت مانتے تھے۔ پہاڑی کی آخری چوٹی پر کھڑے ہو کر مولوی نورالدین نے جھیل کے وسیع پانی میں اُس جگہ کی طرف اشارہ کیا جہاں سلطان زین العابدین نے "زین لنکا" کا محل تعمیر کرایا تھا۔ جگہ کی نشاندہی اب آسانی سے نہیں ہو سکتی تھی۔ صرف پرانے لوگ جنہیں اس علاقے سے پوری واقفیت تھی، اس جگہ کی نشاندہی کر سکتے تھے۔

شام کو ہم سرینگر پہنچے اور اس ضیافت میں شریک ہوئے جو مبارک کے والد نے علی کدل میں اپنے گھر میں کی تھی اور جس میں بہت سے لوگ شامل تھے۔

مبارک نے ایک تجویز رکھی تھی۔ جموں لوٹنے سے پہلے ہم ایک رات پامپور کے زعفران کے کھیت دیکھنے چلیں۔ تجویز بہت مناسب تھی۔ ہم نے مان لی۔ اگلی رات پورے چاند کی رات تھی، اس لیے اگلے ہی دن شام کے بعد ہمیں پامپور جانا چاہیئے۔ مبارک صبح ہی پامپور کے ایک دوست کو پیغام بھجوا دے گا کہ ہم لوگ اگلی رات اس کے مہمان ہوں گے۔ ہم گاڑی میں جائیں گے اور رات کو واپس آجائیں گے۔

سورج ڈھلنے کے بعد ہم پامپور کے لیے روانہ ہوئے۔ ایک پوری لاری کا انتظام کر رکھا تھا مبارک نے۔ مرد لوگ تو ہم صرف پانچ ہی تھے۔ مبارک، راجہ، مولوی نورالدین، بشیر احمد اور میں۔ باقی تو سب عورتیں ہی عورتیں تھیں۔ کچھ زینہ کدل کی اور کچھ علی کدل کی۔ جتنی بھی تھیں وہ سب شبل کی عاشق تھیں۔ مجھے شبل کی شخصیت کے اس پہلو کا زیادہ علم نہیں تھا۔ وہ ایکدم اتنے لوگوں کو اپنا بنا سکتی ہے، وہ بھی عورتوں کو، یہ تو واقعی ایک بہت بڑا کارنامہ تھا۔ کچھ دیر ہم ڈل کے کنارے رُکے اور کنارے پر کھڑے ہو کر ڈل کے خاموش پانی کو دیکھتے رہے۔ لڑکیاں تو کتنے دنوں کے بعد ادھر آئی تھیں۔ وہ سب تو ڈل کے کنارے گھومتی رہیں اور اُن کے ساتھ راجہ بھی لشکارا رہا۔ ہم چاروں کھڑے باتیں کرتے رہے۔ میں نے مولوی نورالدین سے کہا۔

"ہم لوگ جموں میں نیشنل کانفرنس کو زیادہ مضبوط نہیں کر سکے۔ کیا کریں؟"

"دراصل بات یہ ہے کہ شیخ صاحب کی تمام تر توجہ اس وقت وادی پر ہے۔ جب تک

وہ دلچسپی نہیں لیتے کامیابی حاصل نہیں ہو سکے گی ۔"

"میں بھی اسے یہی کہتا ہوں ۔" بشیر احمد بولا ۔

"میرے خیال سے تو آپ لوگ ابھی زیادہ سے زیادہ نوجوانوں کو اپنا ہم خیال بنائیے ۔ ایکبار ایسا ہو گیا تو کامیابی مشکل نہیں ہو گی ۔"

"کوشش تو بہت کر رہے ہیں ہم ۔ لیکن کوئی بڑا لیڈر تو ساتھ ہونا ہی چاہیئے ۔" میں نے جواب دیا ۔

"شیخ صاحب جیسا دوسرا لیڈر تو اب کشمیر میں کبھی نہیں مل سکتا ۔ کوئی مخلص اور تجربہ کار آدمی ملنا چاہیئے آپ کو ۔"

"آدمی تو ہیں مولانا جی ۔ لیکن وہ نیشنل کانفرنس کے اصولوں پر ایمان نہیں لاتے ابھی ۔"

"نیشنل کانفرنس نے بھی تو قومی سطح پر اپنا مقام نہیں بنایا ابھی ۔ اِس میں دیر لگے گی ۔" بشیر احمد بولا ۔

"یار میں تو پست ہمت ہوتا جا رہا ہوں ۔"

"آپ لوگ اپنی جدّوجہد جاری رکھیں ۔ ہم سب آپ کے ساتھ ہیں ۔" مولوی نُورالدین نے جواب دیا ۔

اُسی لمحہ عورتوں کا پورا ٹولہ شبیل کی رہنمائی میں گھُوم پھر کر واپس پہنچ گیا ۔

"اب کیا ارادے ہیں مبارک صاحب ؟"

"لاری میں بیٹھئے ، پامپور چلتے ہیں ۔"

"کتنی دیر میں پہنچ جائیں گے ؟" شبیل نے پوچھا ۔

"زیادہ سے زیادہ آدھ گھنٹے میں ۔"

"پہلے کہاں جائیں گے ؟"

"بس ایک ہی جگہ جائیں گے ۔ زعفران کے کھیتوں میں ۔ میرا دوست دِلنواز سڑک پر ہی ہمارا انتظار کر رہا ہو گا ۔"

"تمہارے دوست کا نام بڑا خوبصورت ہے ۔"

"وہ خود بھی بڑا خوبصورت ہے شبیل جی ۔"

"تو پھر ان لڑکیوں کی حفاظت کرنی پڑے گی ۔"

"وہ شادی شدہ ہے۔ اس کے ساتھ اس کی بیوی بھی ہوگی۔ کھانے کا انتظام تو اُسی نے کرنا ہے۔"

"تو ہم لوگ خطرے سے باہر ہیں؟"

"خطرہ تو دراصل ہم لوگوں کو ہے جو اقلیت میں ہیں۔" میں نے کہا۔

"اقلیتوں کو تو ہمیشہ ہی خطرہ رہتا ہے۔"

رشیل کے اس جواب پر لڑکیاں بہت زور سے ہنسیں اور ایک ایک کر کے لاری میں بیٹھنے لگیں۔

پام پور کا اصلی نام پدم پور ہے، بھگوان وشنو کا شہر۔ جسے ایک ہندو راجہ نے بسایا تھا اور جو کسی زمانے میں بڑی اہمیت کا حامل رہ چکا تھا۔ اس سے آگے تھوڑی دُوری پر ہی توآونتی پور ہے جس کی بنیاد مہاراجہ آونتی ورمن نے رکھی تھی۔ یہ شہر بھی کسی زمانے میں بڑا مشہور تھا اور یہاں کے مندر آج بھی بڑی اہمیت رکھتے ہیں، حالانکہ اب وہ کھنڈروں میں بدل چکے ہیں اور مندروں میں استعمال کیے ہوتے بڑے بڑے پتھر اِدھر اُدھر بکھرے پڑے ہیں۔ سیّاح لوگ جب سرینگر آتے ہیں تو ان مندروں کو ضرور دیکھتے ہیں۔

جب ہماری لاری پام پور کی بستی سے باہر پھیلے کھیتوں کے سامنے پہنچی تو رات ہو چکی تھی اور پورنیما کا چاند آسمان کا تھوڑا سا سفر طے بھی کر چکا تھا۔ سڑک کے کنارے کچھ لوگ لالٹین لیے کھڑے تھے اور ہمارا انتظار کر رہے تھے۔ انھیں میں مبارک کا دوست دِلنواز بھی تھا۔ لاری رُکی تو سب سے پہلے مبارک اور راجہ اُترے اور پھر ہم تینوں۔ مبارک نے دِلنواز سے میرا تعارف کرایا۔ باقی لوگ ایکدوسرے کو جانتے تھے۔

"راجہ تو بڑا چھیلا لگ رہا ہے۔"

"خوبصورت لڑکیوں کے ہجوم کے ساتھ آیا ہے دِلنواز صاحب۔" میں نے کہا۔ میری بات پر سب ہنس پڑے۔

"اس کا بھی کام بنوا دیجئے آج۔" مولوی نورالدین بولا۔

"یہ سب آپ بزرگوں کے ہاتھ میں ہے۔"

"اوپر خدا اور نیچے بزرگ۔ انہی کا راج ہے پوری دنیا میں۔" بشیر احمد نے کہا۔

پھر لاری سے عورتیں بھی اُترنے لگیں۔ سب سے پہلے ڈُون اور رشیل اُتریں۔ ڈُون نے دِلنواز کو آداب کیا اور رشیل کا تعارف مبارک نے کرایا اور کہا۔ بس یہی ہیں اس ٹولے کی لیڈر۔

دِلنواز کی بیوی نے آگے بڑھ کر ڈون کو اپنی بانہوں میں لے کر اس کا ماتھا چُوم لیا اور پھر رشیل کو بھی اپنے بازو کے گھیرے میں لے لیا۔ اور پھر لڑکیوں کی پوری بِھیڑ سڑک پر آگئی۔ اندھیرے کا سماں، چاندنی رات، حسین اور جوان لڑکیوں کا اتنا بڑا ہجوم! اب تو فضا کو دم بخود ہو جانا چاہیئے، میں نے سوچا۔ زندگی تو سمُوچے طور پر ایک مرکز پر سمٹ آئی تھی۔ اب اسے کہیں بھی تو تلاش کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ زعفران زار تو ہمارے سامنے کِھلا ہوا تھا۔ اب ہم کھیتوں میں جا کر کیا کریں گے؟ بس یہی سوچنے لگ گیا تھا میں۔ دن میں تو میں نے ان کھیتوں کو کتنی بار دیکھا تھا لیکن اس بھری چاندنی میں زعفران کی اس وادی کو دیکھنے کا یہ میرا پہلا موقع تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ میں خود مسحور ہو گیا تھا۔

"اے خدا تم نے اپنے دامن میں کیسی کیسی جنّتیں سمیٹ رکھی ہیں۔ کتنی برکتوں اور رحمتوں کا مالک ہے تُو!" مجھے لگا کہ میری روح رازقِ دوجہاں کے حضور میں سجدے کرنے کو بیقرار تھی! رشیل، جو میری ہی طرح جذباتی ہے۔ اس منظر کو دیکھ کر ششدر رہ گئی تھی! مجھے لگا کہ اب تک جو اضطراری کیفیت تھی اُس کی، وہ اچانک ہی ایک گہرے اور پُرسکون ٹھہراؤ میں بدل گئی تھی! اس ماحول نے اس پر بھی جادُو کر دیا تھا جیسے۔

بہت دیر تک لڑکیاں گاتی رہیں اور ایک دوسرے کو چھیڑتی رہیں۔ ڈون تو بے حد خوش تھی۔ دِلنواز ہمارے لیے پچھلے سال کا بہت بڑھیا زعفران لے آیا تھا۔ اس نے وہ رشیل کو پیش کیا۔ وہ مجھے کیسر کی کیاریوں میں گھُماتا رہا اور بہت ہی پیارے پھول دکھاتا رہا جو اب کچھ دنوں میں توڑ لیے جائیں گے اور پھر یہ سارے کھیت ایکدم ویران ہو جائیں گے اور اگلے برس کا انتظار کریں گے۔

"ہم بھی تو اب اگلے ہی برس کا انتظار کریں گے دِلنواز!"

"نہیں اس سے پہلے آپ کتنی بار آئیں گے یہاں۔"

"ضرور آئیں گے۔" بشیر احمد نے کہا۔

"ہمیں ان کی بہت ضرورت ہے۔" مولوی نُورالدین بولا۔

میں خاموشی سے مُسکراتا رہا اور ان تینوں کی طرف دیکھتا رہا۔ کوئی بھی جواب میرے پاس نہیں تھا۔

پھر دِلنواز کی بیوی نے ایک بہت ہی خوبصورت لوک گیت سنایا۔

میرا محبوب پام پور کی طرف گیا تھا۔

زعفران کے پھولوں کی مہک نے اسے اپنی گرفت میں لے لیا۔
میں اس بات سے کتنی رنجیدہ ہوں
کہ میرا محبوب زعفران زاروں میں ہے۔
اور میں یہاں اکیلی فرقت کے لمحوں کو جھیل رہی ہوں ــــ
میرے خدا، مجھے بتا کہ کب میں اپنے
محبوب کا دیدار کر سکوں گی!

زعفران کے پھولوں کی خوشبو سے شرابور فضا اور رات کا خاموش ماحول ایکدم تالیوں کی گونج سے مرتعش ہو گیا۔

دِلنواز نے بہت ہی لذیذ کھانا کھلایا اور پھر ہمیں وداع کر دیا۔ آسمان کے سمندر میں تیرتا ہوا پورا چاند بہت سا سفر طے کر چکا تھا۔

جب ہم اپنے ہاؤس بوٹ میں پہنچے تو آدھی رات گزر چکی تھی۔
اگلی صبح ہمیں جموں کے لیے روانہ ہونا تھا۔
رمضان جُو نے ہمارے جانے کا انتظام کرا دیا تھا۔

جب شِیل اور میں رمضان جُو کے ساتھ بس اسٹینڈ پہنچے تو دیکھا کہ وہاں تو ہمیں الوداع کہنے والوں کی بھیڑ لگی تھی۔ مبارک، راجہ اور ڈُون کے علاوہ اس کی ماں بھی موجود تھی۔ اور وہ سب لڑکیاں بس اسٹینڈ پر جمع تھیں جو کل رات ہمارے ساتھ پامپور گئی تھیں۔ وہ سب تو شِیل کو الوداع کہنے آئی تھیں۔ مجھے خدا حافظ کہنے والے تو صرف بشیر احمد اور مولوی نُورالدین ہی تھے۔ میں ڈُون کی ماں کے پاس کھڑا اسے کہہ رہا تھا کہ وہ اپنی صحت کا دھیان رکھے۔ میری بات سُن کر وہ مسکرائی اور اس کے گالوں کے گڑھے پہلے سے بھی زیادہ گہرے ہو گئے۔ لیکن مجھے لگا کہ میں اس کی مسکراہٹ اور زیادہ گہرے ہوتے ہوتے گالوں کے گڑھوں کو آخری بار دیکھ رہا تھا۔ جانے کیوں مجھے یہ احساس اتنی شِدّت سے ہوا کہ میں نے اس کے کمزور ہاتھ کو اپنے دونوں ہاتھ میں لے کر اسے دوبارہ اپنی صحت کا خیال رکھنے کی تاکید کی۔

پھر ایک لڑکی میرے پاس آئی اور بولی
"آپ شِیل جی کو کب سرینگر بھیجیں گے؟"
"جب وہ مجھے طلاق دے دیگی"

"ہماری سہیلی نوری کی شادی اگلے مہینے ہے۔ شیبل جی کا آنا بہت ضروری ہے۔"

"اسے یہیں روک لونا۔"

"وہ رک نہیں رہیں۔"

"اُسے بس میں مت بیٹھنے دو۔" میں نے کہا۔

"ارے آجاتے گی شیبل، فکر نہ کرو۔" رمضان جُو نے بیچ بچاؤ کرلیا۔

پھران سب لڑکیوں نے ایک بڑا سا پھولدار تھیلا جو جانے کن کن چیزوں سے بھرا ہوا تھا، شیبل کو پیش کیا۔ شیبل نے ایک بار جب میری طرف دیکھا تو میں نے کہا۔

"اپنا خراج وصول کرلو۔"

شیبل نے بحث نہیں کی۔ لڑکیوں نے وہ تھیلا بس کے اندر اُن سیٹوں پر رکھ دیا جہاں ہمیں بیٹھنا تھا۔

بس کے کلینر نے ہمیں بس میں بیٹھنے کو کہا تو میں نے باری باری بشیر احمد، مولوی نورالدین، مبارک، راجہ اور رمضان جُو کو گلے سے لگایا، انھیں خدا حافظ کہا اور بس کے اندر داخل ہوگیا۔ پھر شیبل نے ڈُون کو اپنی بانہوں میں لے کر اس کا ماتھا چوما اور اس کی سب سہیلیوں سے باری باری ہاتھ ملایا اور آخر میں ڈُون کی ماں کو اپنے ساتھ چمٹا کر اُس سے رخصت لی۔

جب بس سٹارٹ ہوئی تو شیبل اپنی گیلی آنکھوں کو پونچھ رہی تھی۔ میں نے دیکھا سب لڑکیاں اپنے ہاتھوں سے اپنے آنسو روکنے کی کوشش کررہی تھیں۔ میں نے کھڑکی سے باہر سر نکال کر سب کو خدا حافظ کہا اور دیر تک سڑک پر کھڑے اپنے دوستوں کو دیکھتا رہا جن کی مہربان دوستی کے تحفے لے کر میں جموں لوٹ رہا تھا۔ اور جن کی محبت نے شیبل کا دامن بھر دیا تھا۔

ڈُون کی ماں ایک طرف کھڑی اپنے فرن کی آستین سے آنکھوں میں بھرے آنسوؤں کو پونچھ رہی تھی۔

۶

"ہندوستان چھوڑو تحریک" مہاتما گاندھی کی زیر قیادت ۱۹۴۲ء میں شروع ہوئی لیکن انگریزوں نے ہندوستان کو چھوڑنے میں پانچ برس لگادیے۔ اور جب اسے چھوڑا تو اس کی

سالمیت کو بڑی طرح مجروح کرکے چھوڑا۔ دو قوموں کی تھیوری کے خنجر سے ایک خوبصورت جسم کے دو ٹکڑے کر دیئے۔ ایک ٹکڑے کا نام پاکستان ہو گیا اور دوسرے ٹکڑے کا نام بھارت۔ سارا جسم اس طرح زخمی کر دیا کہ اس کی وہ شناخت ہی ختم ہو گئی جسے وہ لاکھوں برسوں سے ایک تہذیب کا سمبل بن کر جی رہا تھا۔ اگلی صدی کا مورخ جب اسے پہچاننے کی کوشش کرے گا اور رامائن اور مہابھارت اور ویدوں اور پرانوں کے حوالوں سے اسے تلاش کرنا چاہے گا تو اسے بڑی مایوسی ہو گی۔ اس سے کہیں زیادہ مایوسی تو اس صدی کے آخری دور میں جینے والوں کو ہو رہی ہے، جس میں میرے جیسے لوگ شامل ہیں۔

بھارت کے پاس بہت کچھ گنوانے کے باوجود اپنا ایک شاندار ماضی تھا اور اس کی روشن روایات تھیں۔ اس کے مقابلے میں پاکستان ایک اسلامی ملک کا نیا تصور لے کر سامنے آیا تھا۔ جس کے ساتھ کتنی ذہنی، سماجی اور اقتصادی مسائل جڑے ہوتے تھے۔ اس تصور کو سمجھنے اور اپنانے کے لیے وقت درکار تھا۔ خاص کر اُن کو جو ہندوستان چھوڑ کر پاکستان گئے تھے اور اس سے زیادہ اُنھیں جو مغربی پنجاب میں نہیں بلکہ سندھ یا دوسرے علاقوں میں مہاجر بن کر گئے تھے۔ پاکستان کا ایک مسئلہ ان قبائلی لوگوں کا تھا جو صوبہ سرحد اور افغانستان کے درمیان پہاڑی علاقے میں آباد تھے جن کا رقبہ لگ بھگ ۲۵ ہزار مربع میل تھا اور آبادی تقریباً ۲۴ لاکھ تھی۔ یہ لوگ غریب بھی تھے اور ان پڑھ بھی۔ ان کے پاس کسی مستقل آمدنی کا بھی ذریعہ نہیں تھا۔ تقسیم سے پہلے تو وہ ہندوستان سے ملحقہ دیہات پر حملے کرتے تھے اور لوٹ مار کرکے، اور مردوں، اور عورتوں، اور بچوں کو اغوا کر کے اور اُن کے بدلے میں بڑی بڑی رقمیں حاصل کر کے اپنا گزارہ کر لیتے تھے۔ برٹش سرکار تو ہر سال ان لوگوں کو لوٹ مار سے روکنے کے لیے لاکھوں روپیہ دیتی تھی۔ پاکستان بننے کے بعد ان کی آمدنی کا یہ ذریعہ بند ہو گیا تھا۔ یہ نیا ملک ان کی جارحانہ حرکتوں کو روکنے کے لیے کہاں سے روپیہ فراہم کرتا۔ چنانچہ قبائلی آبادی پاکستان کے لیے ایک مستقل خطرہ بن گئی تھی۔ اگر اس خطرے کو ٹالنے میں تاخیر کی گئی تو یہ لوگ اب پاکستان کے دیہات پر حملے کرنا شروع کر دیں گے۔ اور ایک نئی قسم کا مسئلہ کھڑا ہو جاتے گا۔ پاکستان کے اربابِ سیاست نے اس قبائلی آبادی کی توجہ کشمیر کی طرف مبذول کرا دی۔ اس منطق کے دو پہلو تھے۔ ایک تو یہ کہ کشمیر میں اکثریت مسلمانوں کی تھی اس لیے اسے مجبور کیا جاتے کہ وہ اپنا الحاق پاکستان سے کرے۔ دوسرا پہلو تھا کشمیر کی خوبصورت وادی، جس میں ان کے خیال سے بے پناہ دولت تھی اور جہاں مسلمانوں پر ظلم توڑے جا رہے تھے۔ یہ منطق اہلِ سیاست کے کام آ گئی اور انھوں نے ان غریب

ان پڑھ، دولت کے بھوکے قبائلیوں کو کشمیر کی طرف دھکیل دیا، جہاں ان کے خوابوں کی تکمیل ہوسکتی تھی۔ جہاں انہیں روپیہ، پیسہ، زیورات اور عورتوں کی شکل میں جو کچھ ملے گا وہ ان کا مال غنیمت ہوگا۔

یوں تو قبائلیوں نے ریاست کشمیر کی حدوں میں اگست کے آخری ہفتے میں ہی داخل ہونا شروع کر دیا تھا اور ستمبر اور اکتوبر کے شروع میں چرالہ، کوٹلی اور پونچھ کو ملانے والی سڑک اور میرپور کے علاقے میں شدت سے گھس پیٹھ شروع کر دی تھی لیکن ۲۲ اکتوبر کو مسلح آدمیوں کی ایک بہت بڑی تعداد تین سو لاریوں میں آئی اور مظفرآباد میں لوٹ مار شروع کر دی اور عمارتوں کو نذرِ آتش کر دیا۔

ریاستی فوج کی تعداد بھی کم تھی اور ان کے پاس ویسا اسلحہ بھی نہیں تھا، جیساکہ حملہ آوروں کے پاس تھا۔ مظفرآباد کا سارے کا سارا ضلع لوٹ لیا گیا اور تمام گھروں کو جلا دیا گیا۔ ریاستی فوج کی چوتھی جے اینڈ کے بٹالین بالکل مقابلہ نہ کر سکی۔ فوج کی اس ٹکڑی کی تباہی کے ساتھ اس کا کمانڈر لیفٹیننٹ کرنل، نرائن سنگھ بھی مارا گیا۔ مظفرآباد کا ڈپٹی کمشنر مہتہ بھی قتل کر دیا گیا۔ حملہ آور اپنے پیچھے تباہی اور ہیبت کا ایک ناقابل فراموش ماحول چھوڑ کر اوڑی کی طرف بڑھ گئے جہاں ۲۴ اکتوبر کو انھوں نے قتل و غارت لوٹ مار اور آگزنی کے ساتھ ساتھ عورتوں کی عصمت دری بھی کی اور انھیں اغوا بھی کر لیا۔ ان ظالموں نے عورتوں کو بازاروں میں نیلام بھی کیا۔ اوڑی پر قبضہ کر لینے کے بعد ۲۶ اکتوبر کو حملہ آوروں نے بہت بڑی تعداد میں اور پوری طرح مسلح ہوکر بارہ مولہ پر دھاوا بول دیا۔ سینکڑوں لوگوں کو بیدردی سے قتل کیا۔ گھروں کو لوٹا اور انھیں جلا کر راکھ کر دیا۔ قتل کرتے وقت مذہب وملت کا کوئی امتیاز نہیں کیا۔ انھوں نے ہندوؤں، سکھوں، مسلمانوں، عیسائیوں کو بے رحمی سے قتل کیا۔ یہاں تک کہ سینٹ جوزف کانوینٹ کی تمام عمارت کو جلا کر راکھ کر دیا۔ مریم اور کرائیسٹ کے بتوں کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔ کانوینٹ کی راہباؤں اور ایک انگریز افسر کی بیوی کی عصمت دری کر کے سب کو قتل کیا۔ پھر انھوں نے نیشنل کانفرنس کے ورکر مقبول شروانی کو، جو سری نگر میں موٹر سائیکل پر شیخ صاحب کو بارہ مولہ کی تباہی کا آنکھوں دیکھا حال سنانے گیا تھا، پکڑ لیا اور کئی دنوں تک ہر قسم کی سختی کر کے اس سے پوچھ تاچھ کرتے رہے۔ جب اس نے تمام ظلم سہنے کے باوجود کچھ بھی نہ بتایا تو اسے قصبے کے عین درمیان ایک کھمبے سے لٹکا یا گیا، اس کے ہاتھ پاؤں میں کیل گاڑے گئے اور اس کی ناک کاٹ دی گئی۔ اور پھر اس کے تمام جسم کو گولیوں سے چھلنی کر دیا۔ کئی دنوں کے بعد جب ہندوستانی فوج نے حملہ آوروں کو بارہ مولہ سے نکال دیا، تو مقبول شروانی کی لاش ملی جس کی شناخت کرنا بھی مشکل تھا۔ بارہ مولہ کی سکھ آبادی پر تو قبائلیوں نے بہت ہی ظلم ڈھائے۔ ان مظالم کی

تاب نہ لاکر کئی سکھوں نے تو خودکشی کرلی۔ بہت سی سکھ عورتوں نے بھی اپنے آپ کو مار ڈالا۔ جو باقی بچیں انھیں اُن کے مردوں نے قتل کردیا۔ قصبے میں ایک چھوٹا سا سنیما گھر تھا۔ حملہ آوروں نے اسے قحبہ خانہ بنا دیا اور اس میں عورتوں کی عصمت دری کی۔

حملہ آور جو گھنٹہ بھر میں سرینگر پہنچ سکتے تھے لوٹ مار اور ہوس پرستی کے لالچ میں تین روز تک بارہ مولہ ہی میں پڑے رہے اور کسی بھی طرح سرینگر کی طرف بڑھنے کو تیار نہ ہوتے۔ اس لیے پاکستان کے کچھ ایجنٹ نما اشخاص جو چوری چھپے تخریبی کاموں میں مصروف تھے، بیحد مایوس ہوگئے۔ وہ تو انتظار کررہے تھے کہ کب حملہ آور بارہ مولہ سے رات کے اندھیرے میں سرینگر میں داخل ہوں اور کب وہ سرینگر میں بھی قتل و غارت اور لوٹ مار کرنے میں لگ جائیں۔ جب وہ اپنے اس مقصد میں کامیاب نہ ہوتے تو انھوں نے آپس میں یہ سازش کی کہ وہ تمام پُلوں اور خاص طور پر ایرپورٹ جانے والے راستے کے سارے پُلوں کو تباہ کرڈالیں تاکہ اگر ہندوستانی فوج مدد کے لیے آجاتے تو وہ کسی طرف بھی پیش قدمی نہ کرسکے۔

یہ وہ نازک وقت تھا جب شیخ عبداللہ نے جرأت و فراست کا ثبوت دیا اور سرینگر کی حفاظت کی تمام تر ذمہ داری نیشنل کانفرنس پر ڈالدی۔ اس مقصد کے لیے شیخ صاحب نے نیشنل میلیشیا کی تشکیل کی اور لوگوں سے اپیل کی کہ جس کے پاس جس قسم کا ہتھیار تھا اُسے وہ نیشنل کانفرنس کے حوالے کردیے۔ والینٹرز کو ہتھیار استعمال کرنے کی ٹریننگ دی گئی اور پھر انھیں پُلوں، بینکوں، ڈاک گھروں اور اس قسم کے دوسرے اداروں پر چوکسی کے لئے مامور کردیا گیا۔ والینٹرز کو خاص طور پر یہ ہدایت کی گئی کہ وہ غیر مسلم لوگوں کے گھروں پر پہرہ دیں اور انھیں حفاظت کا پورا یقین دلائیں۔ خواتین میلیشیا نے بھی اہم رول ادا کیا۔ اس میلیشیا کی ایک لیڈر محمودہ بیگم بھی تھی جو نیشنل کانفرنس کی بھی بڑی ایکٹو کارکن تھی۔ محمودہ سے میری ملاقاتیں بھی ہوتی رہی تھیں، جب جب میں سرینگر آیا تھا۔ بلکہ شیبل کی بھی اب اس سے اچھی خاصی شناسائی ہوگئی تھی۔ جب ہم جموں میں نیشنل کانفرنس کا اجلاس کرنے کے بارے میں سوچ رہے تھے تو محمودہ نے پوری پوری مدد کا یقین دلایا تھا اور یہ بھی کہا تھا کہ وہ کچھ اور خواتین ورکرز کو بھی اپنے ساتھ جموں لے کر آتے گی۔

مہاراجہ ہری سنگھ کے سرینگر کو چھوڑ جانے کے بعد تو وادی کا کوئی والی وارث ہی نہ رہا تھا۔ اگر نیشنل کانفرنس شیخ عبداللہ کی قیادت میں عارضی طور پر ایسے اقدام نہ کرتی، جن سے حملہ آوروں کو کچھ دیر کے لیے روکا جاسکتا، تو سرینگر یقیناً ان کے قبضے میں آجاتا۔ شیخ عبداللہ نے اس کے علاوہ دہلی جاکر مہاتما گاندھی، پنڈت نہرو، سردار پٹیل کو سری نگر میں ہندوستانی فوج بھیجنے میں بھی اہم رول ادا کیا۔ وی پی مینن ریاستوں کے محکمے کا سکریٹری، ۲۶ اکتوبر کو کشمیر کے ہندوستان سے الحاق

کے کاغذات لے کر جموں گیا اور مہاراجہ کے دستخط کروا کر کاغذات واپس لے کر دہلی پہنچا۔ چنانچہ ۲۷ اکتوبر کی صبح ہوائی جہازوں سے پہلی سکھ رجمینٹ کے ساڑھے تین سو سپاہی سرینگر کے ہوائی اڈے پر اُترے۔ اس دستے کا کمانڈر لیفٹیننٹ کرنل رنجیت رائے تھا۔

۲۷ اکتوبر کو ہی پنڈت نہرو نے شیخ صاحب کو ایک خط لکھا۔

"ہم نے ایک مشکل کام کا بیڑا اُٹھالیا ہے۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ ہم پار اُتر جائیں گے۔ کل جب سے یہ فیصلہ لیا گیا ہے اور آج جب سے میں نے سُنا ہے کہ ہماری فوج سرینگر میں اُتر گئی ہے، میرے دل کا بوجھ ہلکا ہو گیا ہے۔ اب یہ ہمارے مستقبل کا امتحان ہوگا۔"

سکھ رجمنٹ کے اس دستے نے ان قبائلی حملہ آوروں کو مار بھگایا جو کسی نہ کسی طرح ہوائی اڈے کے قریب پہنچ چکے تھے۔ ہندوستانی فوج کی ایک ٹکڑی فوراً بارہ مولہ کی طرف بڑھ گئی۔ وہاں قبائلی حملہ آوروں کا بڑا زور تھا۔ یہ ٹکڑی کرنل رنجیت رائے کی کمان میں بڑی بے جگری سے لڑی لیکن اُسے پٹن کی طرف پسپا ہونا پڑا۔ کرنل رنجیت رائے اس حملے کے دوران جاں بحق ہو گئے۔ اُس طرف سے قبائلی آگے بڑھتے گئے اور انھوں نے سرینگر سے صرف چار یا پانچ میل دور شال ٹینگ میں اپنا مورچہ جمالیا۔ قبائلی فوجوں کا ایک حصہ بڈگام کی طرف سے ہوائی اڈے پر حملہ کرنے کے لیے آگے بڑھ گیا۔ اس کے ساتھ ہی قبائلی حملہ آور ہندواڑہ، شمبل اور گاندربل کے علاقے میں بھی پھیل گئے۔ حملہ آوروں کو کشمیر کی وادی پر قابض نہ ہو سکنے میں ہندوستانی فوج کا تو بہت بڑا رول ہے ہی لیکن اس کے ساتھ وادی کے عوام کا بھی انھیں آگے بڑھنے سے روکنے میں بہت بڑا حصہ ہے۔ اگر کشمیر کے عوام ہمت ہار جاتے تو وادی کے حالات اتنی جلدی قابو میں نہ آسکتے۔ شال ٹینگ میں ہندوستانی فوج کو کافی کمک مل گئی تھی، اور کچھ بمبار جہاز بھی آ گئے تھے۔ قبائلی صرف تھوڑی دیر ہی مقابلہ کر سکے۔ اور پٹن کی طرف بھاگ کھڑے ہوئے۔ وہاں سے پسپا ہونے تک انھوں نے پٹن کے قصبے کو بُری طرح برباد کر دیا۔ بارہ مولہ سے اُوڑی اور پھر اُوڑی سے مظفر آباد تک بھاگتے ہوئے قبائلی اپنے ساتھ لوٹی ہوئی جائیداد اور اغوا کی ہوئی عورتیں بھی لے گئے۔ بارہ مولہ پر ہندوستانی فوجوں کا دوبارہ قبضہ ہونے کے بعد شیخ عبداللہ، بخشی غلام محمد اور سردار بدھ سنگھ کو ساتھ لے کر اُجڑے ہوئے قصبے کو دیکھنے گئے۔ بس شہر خموشاں کا سا منظر تھا۔ جوں ہی ان لیڈروں کی قصبے میں آمد کی خبر پہنچی، اپنے گھروں کو چھوڑ کر جنگل میں پناہ لینے والے لوگ فوراً بارہ مولہ واپس آنے لگے اور اپنے قصبے کے

دوبارہ اپنے قبضے میں آجانے پر خوشی سے ناچنے لگے۔

جموں کی طرف قبائلیوں کا زیادہ دباؤ پونچھ اور جھنگڑ کے سیکٹر پر پڑا۔ جھنگڑ سے لے کر نوشہرہ تک کا علاقہ ہندوستانی فوج نے قبائلیوں سے خالی کرالیا تھا لیکن اس کے لیے فوج کو بہت بڑی قربانی دینی پڑی تھی۔ جھنگڑ کے محاذ پر جب برگیڈیر عثمان اپنی فوجوں کی پوزیشن کا جائزہ لے رہے تھے، دشمن کی توپ کا گولہ لگنے سے شہید ہو گئے۔ بہرحال قبائلی حملہ آوروں کا مقابلہ جس بے جگری سے وادی کے عوام نے، جن میں سبھی مذہبوں کے لوگ شامل تھے اور ان فوجی سپاہیوں اور افسروں نے جن کا تعلق بھی مختلف مذہبوں سے تھا، اپنی جانیں ہتھیلیوں پر رکھ کر کیا، وہ ان شاندار روایات کا روشن ثبوت تھا کہ کشمیر کے محاذ پر پاکستان اور ہندوستان کی جنگ ہندو اور مسلمان کی جنگ نہیں تھی بلکہ انسانی قدروں کے تحفظ اور تنگ نظری کے خلاف ایک فیصلہ کن لڑائی تھی۔

جب وادی سے بیرونی حملہ آوروں کو نکال دیا گیا تو پنڈت جواہر لال نہرو سرینگر کے دورے پر آئے۔ لال چوک میں ان کے اعزاز میں ایک بڑا شاندار جلسہ منعقد کیا گیا۔ جس میں تقریر کرتے ہوئے انھوں نے شیخ صاحب کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے بلند آواز میں کہا "یہ ہندوستان اور کشمیر کا ملاپ ہے۔"

نہ جانے کیا سیاسی مصلحتیں تھیں جن کی بنا پر یکم جنوری ۱۹۴۸ء کو اچانک جنگ بندی کا اعلان کر دیا گیا۔ یہ وہ لمحہ تھا جب حملہ آور متواتر پیچھے ہٹتے جا رہے تھے اور ہندوستانی فوجیں بڑی مضبوطی سے آگے بڑھتی جا رہی تھیں۔ جب جنگ بندی کی لکیر کھینچنے کا وقت آیا تو ہندوستانی فوج کو کچھ ایسے علاقے بھی خالی کرنے پڑے جن پر انھوں نے بڑی قربانیاں دے کر قبضہ حاصل کیا تھا۔

بہرحال یہ بھی تاریخ کا ایک واقعہ ہے جس پر کوئی مورخ ہی اپنی رائے کا اظہار کر سکتا ہے، مجھ جیسا ایک صحافی اور ادیب نہیں۔

اسی مہینے کی ۳۰ تاریخ کو برلا مندر کی پرارتھنا سبھا میں جاتے ہوئے مہاتما گاندھی کو ناتھورام گوڈسے نے گولی مار کر ہلاک کر دیا تھا۔

" رگھوپتی راگھو راجا رام سب کو سمتی دے بھگوان "

کسی کو سمتی دینا بھگوان کے ہاتھ میں نہیں مہاتما جی۔ یہ خود انسان کے اپنے ہاتھ میں ہی ہے۔ جس کا احساس اسے شاید کبھی نہیں ہوگا۔

۷

اکتوبر ۱۹۴۷ء میں سرینگر پر قبائلی حملے کے دوران شیخ عبداللہ نے بہت ہی اہم رول ادا کیا تھا۔ جس حکمت عملی، دلیری اور سوجھ بوجھ سے شیخ صاحب نے اس نازک موقع پر کام لیا تھا، اس کا تاریخ میں اپنا ایک الگ مقام ہے۔ شیخ صاحب وادی کے ایک لامثال لیڈر بن گئے تھے، جس کا اعتراف نہ صرف کشمیر میں رہنے والے ہی کرتے تھے بلکہ قومی سطح پر بھی لوگوں کو اس بات کا اعتراف تھا۔

لیکن ریاست جموں کشمیر کے وزیر اعظم بننے کے تھوڑے ہی عرصہ بعد شیخ صاحب کا ڈوگرہ راج کے خلاف جو غصہ اب تک دبا ہوا تھا، پوری شدت سے سامنے آگیا۔ وہ مہاراجہ ہری سنگھ کی کھل کر مخالفت کرنے لگے اور جلسوں میں کھُلے بندوں مہاراجہ کے خلاف بولنے لگے۔ جس طریقے سے پنڈت نہرو شیخ صاحب کو، جموں کشمیر میں برسر اقتدار لاتے تھے وہ طریقہ مہاراجہ کو پسند نہیں تھا۔ اُسے ایسا لگتا تھا کہ جیسے قبائلی حملے کے دوران پنڈت نہرو نے کشمیر کے بچاؤ کے واسطے فوجی امداد بھیجنے کے لیے شیخ صاحب کو اقتدار سونپے جانے کی ایک شرط لگا دی تھی۔ مہاراجہ کی پنڈت نہرو سے رنجش کی ایک بڑی وجہ یہ بھی تھی۔ مہاراجہ کے اور شیخ صاحب کے ان ذاتی اور سیاسی اختلافات کے ساتھ ساتھ ایک اور گمبھیر مسئلہ یہ تھا کہ ریاست جموں کشمیر بین الاقوامی سطح پر ایک جھگڑے کی صورت اختیار کر گیا تھا اور یونائیٹڈ نیشنز کے ایجنڈا پر ایک مستقل آئیٹم بن گیا تھا۔ انہی دنوں شیخ صاحب نے سیکورٹی کونسل کے ایک اجلاس میں اپنی تقریر میں مہاراجہ کے خلاف کہا کہ وہ ۲۹ اکتوبر کی رات کو، قبائلی حملے کے دوران رات کے گہرے اندھیرے میں سرینگر سے اپنے خاندان کے افراد کے ساتھ جموں بھاگ گیا تھا اور اپنے ساتھ ہیروں اور زیورات کے ساتھ اپنے درباریوں کو بھی لے گیا تھا اور لوگوں کو حملہ آوروں کے رحم و کرم پر چھوڑ گیا تھا۔ اور اس طرح حکومت کا نظم و نسق شیخ صاحب کے ہاتھ آگیا تھا جس کو مہاراجہ نے بعد میں آئینی شکل دیدی تھی۔ ایک خبر یہ بھی تھی کہ شیخ صاحب خود ۲۵ اکتوبر کو ہوائی جہاز سے دہلی چلے گئے تھے اور جب تک واپس نہیں آتے تھے، جب تک ہندوستانی فوج سرینگر نہیں پہنچ گئی تھی۔ مہاراجہ نے تو سرینگر کو بعد میں چھوڑا تھا۔ مہاراجہ کو اس بات کا علم ہوا تو اُس نے اس کے خلاف پروٹیسٹ کیا اور شیخ صاحب کو ایک طویل خط لکھا اور کہا کہ جو زہریلی قسم کا پروپیگنڈہ اس کے خلاف کیا جا رہا تھا اُسے روکنے کے لیے ضروری قدم اُٹھائے جائیں۔

اور ریاست کے سربراہ ہونے کی حیثیت سے جس عزت اور وقار کا وہ حقدار ہے اُسے ملنا چاہیئے۔ شیخ صاحب نے مہاراجہ کی اس تجویز کو نظرانداز کر دیا اور اپنی اس مانگ کو اور بھی شدت سے دوہرانا شروع کیا کہ مہاراجہ کو حکومت سے دستبردار ہو جانا چاہیئے اور ریاست کو چھوڑ دینا چاہیئے۔ دہلی میں بھی پوزیشن عجیب تھی۔ شیخ صاحب کو پنڈت نہرو کی پوری حمایت حاصل تھی اور مہاراجہ اپنی مجبوریوں اور شیخ صاحب کے توہین آمیز رویے کے سلسلے میں سردار پٹیل کو لکھتا رہتا تھا۔ یہ نہیں کہ سردار پٹیل مہاراجہ کے ان لگاتار خطوں کی طرف توجہ نہیں دیتے تھے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اس وجہ سے ایک سٹیج پر پنڈت نہرو اور سردار پٹیل کے درمیان شدید اختلافات بھی ہو گئے تھے۔ لیکن حالات تیزی سے بے قابو ہوتے جا رہے تھے جس کی سب سے بڑی وجہ تھی کہ سیکورٹی کونسل میں کشمیر کا مسئلہ ایک مستقل ایشو بن گیا تھا اور یہ ضروری ہو گیا تھا کہ ریاست کے اندرونی معاملات میں شدید قسم کا ردو بدل کیا جاتے۔

یوراج کرن سنگھ مجھے جانے کیوں اچھا لگتا تھا۔ خوبصورت، نازک، شرمیلا سا لڑکا جس میں حلیمی بھی تھی اور شاہی وقار بھی تھا۔ مہاراجہ ہری سنگھ اس کا تعارف ٹائیگر کہہ کر کروایا کرتا تھا۔ آج وہ بمبئی سے اپنے پتا مہاراجہ ہری سنگھ اور ماں تارا دیوی کے ساتھ ہوائی جہاز سے جموں آرہا تھا۔

شیل نے تو اب تک نہ مہاراجہ ہری سنگھ کو اور نہ ہی مہارانی تارا دیوی کو قریب سے دیکھا تھا۔ جب میں نے اسے بتایا کہ یوراج کرن سنگھ اپنے والدین کے ساتھ جموں پہنچ رہا تھا اور جموں کے لوگ ان سب کا بڑے تپاک سے استقبال کر رہے تھے تو اس نے کہا۔

"تم بھی ان کا استقبال کرو گے؟"

"ہاں۔"

"تم تو مہاراجہ کے خلاف دن رات تقریریں کرتے ہو، اور اخباروں میں لکھتے ہو۔"

"نہ میں اور نہ ہی میرے ساتھی مہاراجہ کے خلاف ہیں۔ ہم تو فیوڈل ازم کے خلاف ہیں۔ ہمارا جھگڑا کوئی ذاتی جھگڑا نہیں ہے۔"

"مجھے تو لگتا ہے کہ شیخ صاحب مہاراجہ کے ذاتی طور پر خلاف ہیں۔"

"ان کی بعض تقریروں سے تو یہی اندازہ ہوتا ہے۔ لیکن انہیں ایسا نہیں کرنا چاہیئے۔"

"آپ لوگ ان سے بات کیوں نہیں کرتے ہو؟"

"اس بار سرینگر جائیں گے تو شیخ صاحب سے اس سلسلے میں بھی بات کریں گے۔"

"تو آج تم یُوراج کرن سنگھ کے استقبال پر "کرن سنگھ زندہ باد" کے نعرے لگاؤ گے؟"

"نہیں صرف بھیڑ میں کھڑا ہو کر اسے دیکھوں گا۔ یُوراج مجھے اچھا لگتا ہے۔ میری اور اس کی عمر میں پانچ سات سال ہی کا فرق ہے۔"

"تو میں بھیڑ میں کھڑی ہو کر کیا کروں گی؟"

"تم مہاراجہ ہری سنگھ کو اور مہارانی تارا دیوی کو دیکھنا۔ تم نے انہیں قریب سے نہیں دیکھا ہے نا کبھی؟"

"نہیں۔"

"تو بس تیار ہو جاؤ۔ ریزیڈینسی روڈ سے نکل کر رگھوناتھ مندر کے پاس کھڑے ہو جائیں گے اور انھیں دیکھ کر گھر واپس آجائیں گے۔"

جب شیل اور میں رگھوناتھ مندر کے سامنے پہنچے تو دیکھا کہ لوگوں کے ٹھٹھ لگے تھے۔ صرف جموں شہر سے ہی نہیں بلکہ آس پاس کے گاؤں سے اور قصبوں سے بھی لوگ اپنے مہاراجہ، مہارانی اور یُوراج کے استقبال کے لیے صبح سے ہی جمع ہو گئے تھے۔ رنبیر سنگھ پورہ، سوچیت گڑھ، سانبہ، اکھنور، کھٹوعہ، بڑی براہمناں، ستواری، تالاب تلو، نگروٹہ اور جانے کہاں کہاں سے مرد، عورتیں اور بچے قطاروں کی کئی کئی تہوں میں کھڑے تھے۔ مردوں نے عام طور پر رنگدار پگڑیاں اور چوڑی دار پاجامے پہن رکھے تھے۔ اور عورتیں تنگ قمیضوں اور تنگ سُتھنوں میں بڑی ہی بانکی لگ رہی تھیں۔ کئی عورتوں نے تو اخروٹ کے چھلکے مَل کر اپنے ہونٹ بھی رنگ رکھے تھے۔ سکولوں کے بچے کاغذ کی رنگدار جھنڈیاں، پتلی پتلی کِلکوں پر سجائے، پہلی قطاروں میں کھڑے تھے۔ بیچ بیچ میں سرکاری ملازموں کی ٹولیاں بھی بکھری پڑی تھیں۔ دوکانداروں نے آپس میں مل کر رگھوناتھ بازار میں استقبال کے لیے گیٹ بنا رکھے تھے۔

شیل اور میں بھیڑ میں سے راستہ بناتے ہوئے رگھوناتھ مندر سے آگے نکل گئے۔ کیونکہ یہاں بھیڑ بہت زیادہ تھی اور دھوپ بھی سیدھی پڑ رہی تھی۔ تھوڑی دیر چل کر ہم دونوں بزازی کی ایک دوکان کے سامنے کھڑے ہو گئے۔ دکاندار میرا واقف تھا، اس لیے وہاں کھڑے ہونے میں آسانی رہی۔ میرے کچھ اور دوست بھی وہیں آ گئے۔ شیل کو دکان کے اندر بٹھا کر میں اور کچھ اور دوست پاس کی گلی کے ایک مکان کی سیڑھیاں چڑھ کر چھت پر چلے گئے۔ بھیڑ کا جو نظارہ میں

نے اب دیکھا۔ اس کی مثال نہیں تھی۔ مالک مکان، رام دیال، ادھیڑ عمر کا آدمی ریاست پونچھ کا رہنے والا تھا، جو بہت سال پہلے پونچھ چھوڑ کر جموں آگیا تھا۔ یہاں رگھوناتھ بازار میں اس نے اپنی دکان بنائی تھی اور یہ مکان خرید لیا تھا۔ ہمارے ایک دوست کا اس خاندان سے ذرا دور کا رشتہ تھا۔ اسی لیے ہم سب بنا کسی تکلف کے اس چھت پر کھڑے تھے اور مہاراجہ کے استقبال میں کھڑے اتنے بھاری ہجوم کو دیکھ رہے تھے۔

"کتنی خلقت جمع ہے۔" میں نے بازار کے ایک سرے سے دوسرے سرے پر نظر ڈالتے ہوتے کہا۔

"میں نے اتنی بھیڑ کبھی نہیں دیکھی۔" میرے ساتھ کھڑے دوست نے میری بات کی تصدیق کرتے ہوتے کہا۔

"یہ تو اس بھیڑ کا دسواں حصہ بھی نہیں۔" رام دیال بولا۔

"کس بھیڑ کا ذکر کر رہے ہیں آپ لالہ جی؟" میں نے پوچھا۔

"جو بھیڑ میں نے کوئی سترہ اٹھارہ برس پہلے دیکھی تھی۔ اسی چھت پر سے، یہیں سے کھڑے ہو کر۔ اس سے کوئی مہینہ بھر پہلے ہی میں نے یہ مکان خریدا تھا۔"

"کیا موقع تھا؟" میرے دوست نے پوچھا۔

"یوراج کا جنم ہوا تھا۔ مہاراجہ ہری سنگھ مہارانی کے ساتھ یورپ سے واپس آتے تھے۔ یوراج وہیں پیدا ہوا تھا۔ میری عمر اس وقت تیس سال کی تھی۔ یہ مارچ کے مہینے کی بات ہے۔ مجھے اس لیے یاد ہے کہ اسی دن میرا جنم دن بھی تھا۔"

"آپ تو بڑے خوش قسمت ہیں لالہ جی۔" میں نے مسکراتے ہوتے کہا۔

"مارچ کے مہینے میں پیدا ہونے والے سب لوگ بڑے خوش قسمت ہوتے ہیں۔"

"میرا جنم بھی مارچ کا ہے۔" میں نے کہا۔

"پھر تو تم بھی خوش قسمت ہو گے۔"

"اس لحاظ سے خوش قسمت ہوں کہ ایک جاگیردار کی اکلوتی بیٹی نے گھر سے بھاگ کر میرے ساتھ شادی کر لی ہے۔"

"اس کے باپ کی جاگیر تو تمہیں ملے گی ہی۔"

"نہیں ملے گی، بلکہ اس کی وجہ سے مجھے میرے باپ نے بھی فارغ خطی دے دی ہے۔"

"تو پھر تمہاری بیوی اپریل میں پیدا ہوئی ہوگی۔"

"یہ تو ٹھیک ہے۔"

"بس تمہاری بیوی کے ستارے تمہارے ستاروں پر حکومت کر رہے ہیں۔"

"یہ حکومت کب تک قائم رہے گی؟"

"جب تک ڈوگرہ راج قائم ہے۔"

لالہ رام دیال کی بات پر سب کھُل کر ہنسنے لگے۔

"وہ جو آپ سترہ اٹھارہ برس پہلے والی بِھیڑ کی بات کر رہے تھے۔ اس کا کیا ہُوا؟"

"لو وہ بھی سُن لو۔ ذرا اُدھر ہو جاؤ سایے میں۔ دھُوپ تیز ہے۔"

ہم سب دیوار کے سایے میں کھڑے ہو گئے اور لالہ جی نے اپنی بات کہنا شروع کی۔

"اپریل ختم ہو چکا تھا اور مئی کے مہینے کے شروع کے دن تھے۔ دھُوپ آج سے زیادہ تیز تھی۔ میں اور میری بیوی اور بیٹا رام تیرتھ یہیں کھڑے تھے۔ لوگ بھڑکیلے لباس پہنے، صبح ہی سے سڑکوں اور بازاروں اور مکانوں کی چھتوں پر جمع ہونے لگے تھے۔ ستواری سے لے کر رام محل تک جو مہاراجہ کا محل تھا، یہی حال تھا۔ حالانکہ وہاں تک مہاراجہ کی بگھی کو پہنچنے میں دوپہر ہو جانی تھی۔ لوگ خوشی سے پاگل ہو رہے تھے۔ مہاراجہ ہری سنگھ کی تین مہارانیوں سے کوئی اولاد نہ ہوئی تھی۔ مہارانی تارا دیوی چوتھی مہارانی تھی۔ وہ کانگڑا کے ایک گاؤں کی سیدھی سادی لڑکی تھی۔ شادی کے بعد اس کا بھائی ٹھاکر رنجیت سنگھ بھی یہیں رہنے لگا تھا۔ جموں کے عوام کا اپنے مہاراجاؤں سے بڑا پیار تھا۔ اور وہ ان کے وفادار تھے۔ اب ایک طرح کا ڈر اُن کے دلوں میں سمانے لگا تھا کہ اگر مہاراجہ ہری سنگھ کے ہاں کوئی نرینہ اولاد نہ ہوئی تو ریاست جموں کشمیر میں ڈوگرہ راج ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائے گا اور انگریزی سرکار اپنی پالیسی کے مطابق ریاست کو اپنے قبضے میں کر لے گی۔ صرف ڈوگرہ راج ہی کا نہیں بلکہ ڈوگرہ قوم کا ہی وجود ختم ہو جائے گا۔

اس لیے جب یُوراج کے جنم کی خبر ریاست میں پہنچی تو لوگوں کے دلوں میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ سرکاری اعلان کے مطابق جموں کشمیر میں تین دن کی چھٹی کر دی گئی۔ جانوروں کے ذبح کرنے اور شکار کرنے اور مچھلی پکڑنے پر پابندی لگا دی گئی۔ مندروں، مسجدوں اور گُردواروں میں پرارتھنائیں کی گئیں اور چڑھاوے چڑھائے گئے۔ اور یُوراج کی درازیِ عمر کے لیے دعائیں مانگی گئیں۔ بچوں میں مٹھائی تقسیم کی گئی۔ جموں میں یُوراج کے پیدا ہونے کا اعلان مہاراجہ ہری سنگھ کے وزیر

مسٹر ویکفیلڈ نے اور سرینگر میں یہ اعلان مہاراجہ کے دوسرے وزیر جنرل جنک سنگھ نے کیا۔

مہاراجہ ہری سنگھ اور اس کی پارٹی جب جموں پہنچے تو باہو کے قلعے سے اکیس توپوں کی سلامی دی گئی۔ توپوں کے گولوں کی آواز سارے شہر میں گونج رہی تھی۔ گلیوں اور بازاروں میں بکھرے پڑے لوگ ترتیب سے قطاروں میں کھڑے ہونے لگے اور کچھ ہی لمحوں میں لوگوں کی قطاروں کی رنگ برنگی لہریں پوری شدت سے اُبھرنے لگیں۔ میں نے تو آج تک سمندر نہیں دیکھا۔ کشمیر کے لوگوں کے لیے تو ڈل اور وُلر جھیل ہی سمندر رہیں لیکن یہ حقیقت ہے کہ لوگوں کی بھیڑ کا سمندر ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔

مہاراجہ ہری سنگھ اور مہارانی تارا دیوی ایک کھُلی بگھی میں بیٹھے تھے اور دونوں ہی بڑے ہی تر و تازہ، خوش و خرم اور بہت خوبصورت لگ رہے تھے، 'مہاراجہ ہری سنگھ زندہ باد' اور 'امر رہے' کے نعروں سے فضا گونج رہی تھی۔ بگھی کے پیچھے کار میں چند ہی ہفتوں کا یُوراج اپنی انگریز نرس کے ساتھ آنکھیں بند کیے خاموش پڑا تھا اور نہیں جانتا تھا کہ انسانی محبت اور پیار کے سمندر کی اُمڈتی ہوئی لہریں اس کے پاؤں کو چھونے کو بیقرار تھیں۔ جہاں جہاں سے بگھی اور کار گزرتی گئی لوگ ان پر پھول پھینکتے رہے۔ مہاراجہ ہری سنگھ اور اس کی مہارانی ہاتھ جوڑ کر بازار کے دونوں طرف کھڑی بھیڑ کا شکریہ ادا کر رہے تھے۔ اتنی بھاری بھیڑ کا نظارہ اس کے بعد میں نے کبھی نہیں دیکھا۔

پانچ دن جموں میں ٹھہرنے کے بعد مہاراجہ اپنی مہارانی اور یُوراج کو لے کر سری نگر چلے گئے۔ ان پانچ دنوں میں دعوتیں ہوتی رہیں، موسیقی کے پروگرام ہوتے رہے۔ گلدستے پیش کیے جاتے رہے۔ سارے شہر میں دیپ مالا ہوتی رہی اور گھر گھر میں مٹھائی تقسیم ہوتی رہی۔ لگتا تھا یہ جشن کبھی ختم نہیں ہوگا۔ پھر یُوراج کے نام کرن سنسکار کی تقریب ہوئی اور اعلان ہوا کہ اس کا نام شری یُوراج کرن سنگھ جی بہادر رکھا گیا تھا۔ ۱۹۴۷ء تک ۹ مارچ کے دن ساری ریاست میں چھٹی ہوتی رہی تھی کہ وہ یُوراج کرن سنگھ کی سالگرہ کا دن تھا۔ اس کے بعد یہ پرتھا ختم کر دی گئی۔"

لالہ رام دیال اپنی بات یہیں تک کہہ پایا تھا کہ باہو کے قلعہ سے توپوں کے داغے جانے کی آواز آنے لگی۔ مہاراجہ ہری سنگھ، مہارانی تارا دیوی اور یُوراج کرن سنگھ شہر کی حدود میں داخل ہو چکے تھے۔ نیچے بازار میں کھڑے لوگ ایک دوسرے کو دھکیلتے ہوتے آگے کی قطاروں میں جگہ لینے کی کوشش میں مصروف ہو گئے۔ اور ہم سب جو اتنی دیر چھت کے مالک لالہ رام دیال کی بات کو بڑی توجہ

سے سُن رہے تھے، بنا اُس سے کچھ کہے سیڑھیوں کی طرف لپک پڑے۔ ہم سب لالہ جی کو بھول گئے جو ابھی تک دیوار کے سایے میں کھڑے تھے۔ سیڑھیاں اُترتے ہوئے مجھے لگا جیسے لالہ جی ابھی اپنی بات کہے جا رہے تھے کیونکہ کہانی تو بہت لمبی تھی اور سُننے والوں کی اپنی اپنی مجبوریاں تھیں۔

بازار میں پہنچ کر میں تیزی سے اپنے دوست کی بزازی کی دوکان کی طرف بڑھا، جہاں شیل اتنی دیر سے لکڑی کے بینچ پر بیٹھی میرا انتظار کر رہی تھی اور خود کاٹھ ہوتی جا رہی تھی۔

"مجھے برف میں لگا کر کہاں چلے گئے تھے؟" اس نے شکایت کی۔

"خود کو دھوپ میں پگھلانے کے لیے۔"

"تم سوائے باتوں کے کچھ نہیں کر سکتے۔"

"ذرا سوچ کے بتاؤ، کچھ اور بھی کر سکتا ہوں کہ نہیں؟"

"شرم نہیں آئے گی کبھی، تمہیں؟" شیل نے لکڑی کے بینچ سے اُٹھتے ہوئے کہا۔

بزازی کی دکان کا میرا دوست ہماری گفتگو سُن کر ہنس رہا تھا۔ پھر ہم تینوں دُکان سے باہر نکل آئے اور ایک بہت بڑی بھیڑ کا حصہ بن گئے، جو یُوراج کرن سنگھ کے استقبال کے لیے جمع تھی۔

کھُلی بگھی میں سوار یُوراج کرن سنگھ بڑا ہی خوبصورت لگ رہا تھا۔ اس دن کے بعد اس شخص سے مجھے بے حد پیار ہو گیا۔ میری ماں ٹھیک ہی کہا کرتی تھی کہ راجاؤں مہاراجاؤں کے خون کا اثر کئی پُشتوں تک قائم رہتا ہے۔ وہ فقیر بھی ہو جائیں تو ان کی فقیری میں بھی ایک خاص قسم کے وقار اور شان کے آثار نظر آتے رہتے ہیں۔ شیل نے مہاراجہ ہری سنگھ اور مہارانی تارا دیوی کو اتنی نزدیک سے پہلی بار دیکھا تھا۔ بازار کے دکاندار پھولوں کے ہار پیش کر رہے تھے اور بگھی کچھ دیر کے لیے اُس جگہ رُک گئی تھی جہاں ہم لوگ کھڑے تھے۔ نعروں سے آسمان گونج رہا تھا اور پھولوں کی خوشبو سے سارا بازار مہک رہا تھا۔

پھر آہستہ آہستہ بگھی آگے بڑھ گئی اور بھیڑ کے سمندر کی لہریں بھی اِدھر اُدھر بکھرنے لگیں۔ جموں میں مہاراجہ ہری سنگھ کا یہ آخری شاندار استقبال تھا۔ اس کے بعد حالات فوراً ہی تیزی سے بدلنے شروع ہو گئے۔

اس دن شیل بہت اُداس رہی۔ اس نے مجھے اُداسی کی وجہ تو نہیں بتائی لیکن میں نے خود ہی اندازہ کر لیا تھا۔ وہ اپنی ماں کو بھی فیوڈل ازم کا ایک سمبل سمجھتی تھی۔ آج فیوڈل ازم کی جو شان وہ دیکھ کر آئی تھی، اس سے وہ اپنے موجودہ حالات کا مقابلہ کر رہی تھی۔ شاید سوچ رہی تھی کہ اگر وہ مجھ جیسے بیکار قسم کے آدمی سے شادی نہ کرتی تو اپنی ماں کے دربار کی جانشین وہ خود بنتی اور جاگیرداری

کی پرتھا کو قائم رکھنے کا ایک سادھن بن جاتی۔ لیکن میرے ساتھ رہ کر اسے یہ اندازہ بھی ہو گیا تھا کہ جاگیردارانہ نظام اب ایک بجھتا ہوا چراغ تھا جس کی روشنی پر زیادہ بھروسہ نہیں کیا جا سکتا۔ شاید یہی کارن تھا کہ شام تک بجھی بجھی سی رہنے کے بعد اس کا موڈ آپ ہی آپ بدل گیا اور پھر وہ معمول کی طرح شگفتہ اور تروتازہ نظر آنے لگی۔

مہارانی تارا دیوی ایک دردمند دل رکھنے والی خاتون تھی۔ اسے ایک عام اُجڑ کر آتے ہوتے آدمی کی ذہنی اذیت کا اندازہ تھا۔ جموں پہنچتے ہی اس نے ریفیوجی کیمپوں میں چکر لگانے شروع کیے۔ قبائلی حملوں کے بعد لوگ اپنی جانیں بچا کر بھاگے تھے اور اپنے بھرے پُرے گھر چھوڑ آتے تھے۔ مظفرآباد، میرپور، راجوری، بھمبھر اور ایسے کئی دوسرے کیمپوں میں قتل و غارت کے جو دلدوز نظارے یہ لوگ دیکھ کر آئے تھے، جب وہ اپنی رقت آمیز آوازیں ان کی داستانیں سناتے تو آنکھوں میں آنسو آ جاتے۔ ہماری پارٹی کی کچھ ورکرز بھی ان کیمپوں میں کام کر رہی تھیں۔ رشیل، سبھاشنی مہاجن اور کئی دوسری لڑکیاں گھروں سے کپڑے اکٹھے کر کے کیمپوں میں بانٹ رہی تھیں اور مریضوں کو ڈاکٹری مدد بھی پہنچا رہی تھیں۔ مہارانی تارا دیوی ان اُجڑے ہوتے لوگوں کے لیے چندہ بھی اکٹھا کر رہی تھیں اور اپنی گرہ سے بھی ہزاروں روپے خرچ کر رہی تھیں۔ یوراج کرن سنگھ بھی اپنی ماں کے ساتھ ریفیوجی کیمپوں میں اکثر چکر لگاتا رہتا تھا۔ قبائلیوں کے حملے کے ڈیڑھ سال بعد تک بھی اُجڑے ہوتے لوگ ابھی تک نہیں بسے تھے۔

ایک شام جب رشیل تھکی ہاری گھر لوٹی تو بولی۔

"کیا تم ایک پیالی گرم گرم چائے پلا سکتے ہو، میرے نکمّے اور بیکار ہسبینڈ؟"

"ضرور پلا سکتا ہوں، میری جاگیردار اور اڑتالیس گھنٹے کام کرنے والی ہونہار وائف۔"

کچھ لمحے تو ہم دونوں ہنستے رہے۔ پھر میں کچن میں جا کر چائے بنا لایا۔ چائے پیتے ہوتے رشیل نے کہا۔

"مہارانی کو تو کیمپوں میں رہنے والوں سے بڑی ہمدردی ہے۔"

"اور یوراج کو؟" میں نے پوچھا۔

"اسے تو ہر شخص پیار کرتا ہے۔ بوڑھی عورتیں تو اسے آشیرواد دیتے ہوتے نہیں تھکتیں۔"

"لیکن سچوایشن بڑی عجیب سی ہوتی جا رہی ہے۔"

"کیسے؟" رشیل نے سوال کیا۔

"جموں کا تمام علاقہ مہاراجہ ہری سنگھ کے ساتھ ہے اور کشمیر کی وادی شیخ عبداللہ کو اپنا لیڈر مانتی ہے۔ اور ادھر سیکورٹی کونسل میں رائے عامہ کا تقاضہ ہے۔ مسئلہ بڑا الجھا ہوا ہے۔"

"تو کیا ہوگا؟"

"کچھ بھی ہوسکتا ہے۔ شیخ صاحب چاہتے ہیں کہ مہاراجہ ریاست کو چھوڑ کر چلا جائے اور مہاراجہ اس بات کو ماننے کے لیے تیار نہیں۔ اب یہ سب گورنمنٹ آف انڈیا پر ڈی پینڈ کرتا ہے۔"

"یعنی ہمارے گھر کا جھگڑا ایک تیسری پارٹی طے کرے گی۔"

"ایسی بات نہیں ہے شیل۔ کشمیر کا ہندوستان سے الحاق ہو جانے کے بعد گورنمنٹ آف انڈیا تیسری پارٹی نہیں رہی۔ کشمیر کے بارے میں کوئی بھی فیصلہ اب اسی کے کہنے سے ہو سکتا ہے۔ یہ فیصلہ نہ تو شیخ صاحب کر سکتے ہیں نہ مہاراجہ ہری سنگھ۔"

"ہم لوگ کیا کر سکتے ہیں؟"

"ٹریجڈی یہ ہے کہ ورکرز کا رول بڑا محدود ہے۔ وہ جلسے کر سکتے ہیں، ریلیاں کر سکتے ہیں، جھنڈے لہرا سکتے ہیں، نعرے لگا سکتے ہیں لیکن فیصلے نہیں کر سکتے۔ فیصلے صرف لیڈر ہی کرتے ہیں اور کئی دفعہ یہ فیصلے ان کی ذاتی اغراض اور پسند اور ناپسند پر مبنی ہوتے ہیں۔"

"یہ تو بڑی عجیب بات ہے۔"

"لیکن حقیقت یہی ہے شیل۔"

"ہم مہاراجہ سے تو کچھ نہیں کہہ سکتے لیکن شیخ صاحب سے تو بات کر سکتے ہیں۔"

"وہ تو ہم کریں گے ہی۔ لیکن وہ بھی بڑا ضدی شخص ہے۔ لیڈر میں حد سے زیادہ انا کا ہونا کئی بار خطرناک ثابت ہوتا ہے۔"

"اس کا مطلب ہے تمہاری راہیں خاصی مشکل ہیں۔"

"ہاں۔" میں نے ایک لمبا سانس لیتے ہوئے کہا اور پھر بستر پر دراز ہو گیا۔ لگا کہ معاملہ سنگین تھا۔ اگلے دن رمضان جو کا خط ملا۔ ڈون کے ہاں بیٹی نے جنم لیا تھا۔ اس کا اور مبارک دونوں کا اصرار تھا کہ ہم دو ایک دن کے لیے سرینگر آئیں۔

بس سرینگر جانے کا بہانہ ہاتھ آگیا۔ میں نے بشیر احمد کو خط لکھا کہ شیل اور میں اگلے ہفتہ سرینگر آرہے تھے اور ہمارا قیام رمضان جو کے ہاؤس بوٹ میں ہوگا۔ انہی دنوں نیشنل کانفرنس کے ورکرز کا ایک اجلاس بھی ہو رہا تھا، جس میں شیخ عبداللہ ریاست میں پیدا ہوتے نئے حالات کے بارے

میں ورکرز سے بات کرنے والے تھے اور اپنے اپنے رینکس کو مضبوط کرنے پر زور دینا چاہتے تھے۔

ہم بس سے سرینگر پہنچے تو رمضان جُو، مبارک اور بشیر احمد تینوں ہی بڑے تپاک سے ملے۔ رمضان جُو نے شیل کو گلے لگاتے ہوئے کہا۔

"ڈُون تمہیں دیکھے گی تو باغ باغ ہو جائے گی۔"

"کون سا باغ، نشاط باغ یا شالیمار باغ؟"

"دونوں ہی۔" رمضان جُو نے قہقہہ لگاتے ہوتے کہا۔ میرا اور بشیر احمد کا قہقہہ بھی اس کے قہقہے میں شامل ہو گیا۔ گویا کہ ہمارے قہقہے بھی باغ باغ ہو گئے تھے۔

رمضان جُو نے اپنا ہاؤس بوٹ ایکدم ٹپ ٹاپ کر رکھا تھا۔

"رمضان جُو چاچا تم نے تو بڑے ٹھاٹھ کر رکھے ہیں۔"

"ہمارا ایک بڑا ہی معزز مہمان جو آنے والا تھا۔" اُس نے میری طرف اشارہ کرتے ہوتے کہا۔

"یہ ہے تمہارا معزز مہمان؟ اسے تو اس کے ماں باپ بھی نہیں پہچانتے۔" شیل ہنسی۔

"معزز مہمانوں کا عموماً یہی حال ہوتا ہے۔"

"تو اس کا مطلب ہے جب آپ ان کے گھر جائیں گے تو یہ لوگ آپ کو اتنا ہی بڑا مہمان سمجھیں گے۔" بشیر احمد بیچ میں ہی بول اٹھا۔

"ہاں۔ اس لیے کہ مجھے بھی میرے گھر والے نہیں پہچانتے۔"

بس پھر دیر تک قہقہے گونجتے رہے۔ اِتنے میں ایک گورا خوبصورت سا لڑکا چائے کا سامان لے کر آ گیا۔

"وہ راجہ تھا مبارک کا چھوٹا بھائی بڑا ہی پیارا لگ رہا تھا۔ اب راجہ ہی ڈُون کی جگہ آپکی خدمت کرے گا۔"

"تو ڈُون سے ملاقات نہیں ہو گی چاچا؟"

"وہ کل صبح آئے گی اور پھر یہیں آپ کے پاس ٹھہرے گی۔ اس کی بیٹی بڑی خوبصورت ہے۔ بالکل ڈُون پر گئی ہے۔"

"کیا نام رکھا ہے بیٹی کا؟" شیل نے پوچھا۔

"اس کا نام تم رکھو گی۔ اسی لیے تو تم لوگوں کو بُلایا ہے اُس نے۔"

چائے کے دوران شیل اور رمضان جُو آپس میں باتیں کرتے رہے اور بشیر احمد اور میں کھڑکی کے سامنے کھڑے چائے بھی پیتے رہے اور بات چیت بھی کرتے رہے۔ جمعہ کے دن مجاہد منزل میں

ورکرز کی کانفرنس تھی، جس میں وادی کے مختلف علاقوں سے نیشنل کانفرنس کے ممبرز آرہے تھے۔ بشیر احمد نے سبھاشنی مہاجن اور گندو ترا کو بھی دعوت نامے بھیج دیے تھے اور اُن سے کہا تھا کہ وہ اپنے ساتھ کچھ اور بھی پارٹی ورکرز لے آئیں تاکہ جموں کی بھی نمائندگی ہو سکے۔ ان سب کے ٹھہرنے کا انتظام اس نے ہمارے نزدیک ہاؤس بوٹ میں کر رکھا تھا، تاکہ ہم سب لوگ قریب ہی رہیں۔ اور آپس میں تبادلہ خیالات کر سکیں۔

اگلی صبح ہم ناشتہ کر رہے تھے کہ ڈون اور مبارک دونوں آگئے۔ ڈون نے کالا فرن پہن رکھا تھا۔ وہ پہلے سے زیادہ خوبصورت لگ رہی تھی۔ اس کا رنگ بے حد نکھر گیا تھا۔ مبارک بھی ایکدم سمارٹ ہو گیا تھا۔ میں نے ڈون کو اپنی بانہوں میں لے کر اس کا ماتھا چوم لیا تھا۔

" مجھے معلوم ہوتا تم اتنی زیادہ خوبصورت ہو گئی ہو تو تمہارے گال پر تھوڑی سی سیاہی لگانے کا انتظام کر رکھتی۔"

"اس کی ضرورت نہیں۔ اسے نظرِ بد سے بچانے کے لیے میں جو ساتھ ہوں۔" مبارک بولا۔

" خدا کرے تم دونوں ہی ایکدوسرے کو نظرِ بد سے بچاتے رہو۔" میں نے کہا۔

پھر شیل نے ڈون کی بیٹی کو اپنی بانہوں میں لے لیا۔ وہ واقعی پوری کی پوری اپنی ماں پر تھی۔ کوئی اور ہوتی تو میں اس سے مذاق میں ضرور کچھ کہتی۔ لیکن وہ تو میری چھوٹی بہن تھی۔ اس سے مذاق واجب نہیں تھا۔ ڈون نے ہاؤس بوٹ کے پیچھے والے کمرے میں اپنا سامان رکھوا دیا۔ جتنے روز ہم یہاں رُکیں گے وہ ہمارے ساتھ ہی رُکے گی۔ یہی فیصلہ کر کے آئی تھی وہ۔

" آپا اس کا کوئی پیارا سا نام رکھ دو۔"

" ہم تو بس آپ ہی کا انتظار کر رہے تھے۔" مبارک بولا۔

"کیسا نام پسند ہے تمہیں ؟ مسلمانوں والا، ہندوؤں والا، انگریزوں والا ؟"

"آپ کی پسند والا آپا۔"

"یہ تو کوئی جاگیردارانہ نام رکھے گی۔" میں نے ٹوک دیا۔

"تو تم رکھ لو۔ اصل میں تمہیں مجھ سے بڑی جلن ہوتی ہے۔" شیل نے کہا۔

"اسی لیے تو جموں سے بھاگ کر یہاں آیا ہوں۔ جلن کچھ کم ہو جاتے۔"

" جلن یہاں آکر بھی کم نہیں ہو گی۔"

"کوشش تو کروں گا ہی۔"

"تم نام تو رکھو ذُون کی بیٹی کا۔"

"رکھ دُوں گی۔ تمہیں کیا جلدی ہے؟"

بہت دیر تک ذُون اور شبِل سر جوڑ کر کھسر پھسر کرتی رہیں اور بشیر احمد کے آجانے پر میں اُس کے ساتھ باہر چلا گیا۔ مبارک بھی اپنے کام سے چلا گیا۔

بشیر احمد سے بات چیت کے بعد اور اپنے ساتھیوں سے مل کر مجھے یہ اندازہ ہوا کہ ماحول میں بڑا تناؤ تھا۔ پچھلے کئی دنوں سے شیخ عبداللہ اور مہاراجہ ہری سنگھ کے درمیان اختلافات بہت زیادہ بڑھ گئے تھے۔ شیخ صاحب کی مہاراجہ کے خلاف پنڈت نہرو سے باقاعدہ خط وکتابت تھی اور وہ اپنے خطوں میں مہاراجہ کے تمام اختیارات چھین لیے جانے کی تجویز رکھے جا رہے تھے۔ در اصل وہ کشمیر کے ہندوستان سے الحاق کے مسئلے کو رائے عامہ سے جوڑ کر، جو یونائیٹڈ نیشنز میں اب ایک مستقل آئیٹم بن چکا تھا، اپنے لیے زیادہ سے زیادہ طاقت حاصل کرنا چاہتے تھے۔ حقیقت یہ تھی کہ شیخ صاحب کی ایک ہی مانگ تھی جسے وہ مختلف پہلوؤں اور کئی کئی زاویوں سے بار بار پیش کر رہے تھے۔ وہ مانگ تھی کہ مہاراجہ ہری سنگھ ریاست جموں وکشمیر کو فوراً چھوڑ جاتے۔ چاہے تو وہ دست بردار ہو جاتے چاہے اور کسی طرح ریاست سے نکل جاتے۔ یہ ایک ایسی مانگ تھی مہاراجہ جسے ماننے کے لیے تیار نہ تھا لیکن شیخ صاحب اپنی ضد پر اڑے ہوتے تھے۔

نیشنل کانفرنس کے ورکرز کا جو اجلاس جمعہ کو ہو رہا تھا، اس کا پس منظر یہی تھا۔ شیخ صاحب چاہتے تھے کہ اُن کی مانگ صرف ان کی ذاتی مانگ نہ رہ کر تمام نیشنل کانفرنس کی اور اس کے ورکرز کی مانگ بن جاتے اور اس کے لیے گورنمنٹ آف انڈیا پر زیادہ سے زیادہ دباؤ ڈالا جاتے۔ ذاتی طور پر مجھے اس سے اختلاف تھا لیکن میں نے اس کا کھُل کر اظہار نہیں کیا۔ میں ابھی حالات کا گہرائی سے جائزہ لینا چاہتا تھا۔

بشیر احمد اگلے دن ملنے کا وعدہ کر کے چلا گیا۔ اُسے ابھی کئی اور ساتھیوں کے ٹھہرنے کا انتظام کرنا تھا جو اگلے دو دنوں میں وادی کے مختلف علاقوں سے آنے والے تھے۔

میں شام کو بہت دیر سے لوٹا۔ سبھی میرا انتظار کر رہے تھے۔ ذُون کی بیٹی شبِل کے بستر پر گھوک سوئی پڑی تھی۔ اُس پیارے سے کمبل میں جو شبِل اس کے لیے لائی تھی۔

"تمہارا تو گھر آنے کو جی ہی نہیں کرتا۔" شبِل نے کہا۔

"سبھی وہ مرد جن کی بیویاں انھیں ڈانٹتی رہتی ہیں، زیادہ سے زیادہ گھر سے باہر ہی رہتے ہیں۔

کیوں مبارک ہ؟"
میں نے مبارک کی طرف اشارہ کیا جو کچھ ہی لمحے پہلے آیا تھا۔
"جی آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔"
"ذُون سے پوچھ کر جواب دیا ہے نا؟"
"نہیں جناب۔ بعد میں معافی مانگ لوں گا۔"
ہاؤس بوٹ قہقہوں سے لالہ زار بن گیا۔ اس طرح کے نازک نازک لمحے زندگی کو کتنا خوشگوار بنا دیتے ہیں۔
"میری بیٹی کا نام تلاش کیا ہے آپ نے؟" ذُون نے پوچھا۔
"تین نام سوچے ہیں۔"
"بتائیے۔"
"نغمہ۔ نشاط۔ بختاں والی۔"
"مجھے تو آخری نام پسند ہے۔" شیل بولی۔
"اور مجھے بھی۔" مبارک نے کہا۔
"اور تمہیں؟" میں نے ذُون سے پوچھا۔
"یہ لڑکی بڑی بختاں والی ہے۔" رمضان جُو نے کہا جو ابھی ابھی آیا تھا اور کسی نے اسے دیکھا نہیں تھا۔
"بڑا پیارا نام ہے بھائی جان!" ذُون نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔
"تمہاری بیٹی کو اس نام سے صرف کشمیر کی وادی ہی نہیں جانے گی بلکہ وادی سے باہر کی دنیا میں بھی یہی پہچان بنے گی اُس کی۔" میں نے کہا۔
"دُعا کیجئے اس کے حق میں۔" رمضان جُو بولا اور ہم سب نے سجدے میں سر جھکا دیے، خدا کے حضور میں جو سب کا والی ہے اور جو سب کو اپنے کرم سے نوازتا ہے۔
اُس رات کا کھانا واقعی "وازوان" تھا۔ ذُون کی ماں صبح سے ہی تیاری میں لگی رہی تھی۔ لیکن کھانے میں شریک نہیں تھی۔ ذُون سے پوچھا تو اس نے کہا وہ کل شریک ہو گی۔ مبارک کا بھائی راجہ ہم سب کی خدمت کرنے سے بہت خوش تھا۔
سونے سے پہلے ذُون نے سماوار میں بہت بڑھیا چائے بنا کر پلائی اور پھر شیل کو اپنے کمرے

میں ساتھ ہی لے گئی۔ میں اکیلا پلنگ پر پڑا ریاست جموں کشمیر کے حالات کے بارے میں سوچتا رہا اور میری نظروں کے سامنے بار بار یُوراج کا چہرہ گھوم جاتا تھا۔ دو ضدی شخصیتوں کی لڑائی میں ایک معصوم اور ناتجربہ کار نوجوان خواہ مخواہ پریشان ہو گا۔ شیل کب دُون کے کمرے سے آئی اور کب بستر پر پڑ کر سو گئی۔ مجھے معلوم بھی نہ ہوا۔

دو دن کے بعد گندوترا، سبھاشنی مہاجن اور تین اور ورکرز بھی آ گئے۔ بشیر احمد نے، شیل نے اور میں نے سب کو ریسیو کیا اور انھیں قریب والے ہاؤس بوٹ میں لے آئے۔ شام کو ہمارے والا ہاؤس بوٹ تو ایک طرح سے جلسہ گاہ بن گیا۔ ہم سب جمعہ کے دن مجاہد منزل میں ہونے والی کانفرنس کے بارے میں بات کرتے رہے اور یہ طے کرتے رہے کہ اس کانفرنس میں جموں کی نمائندگی کرنے والے ورکرز کا کیا رول ہونا چاہیئے۔ اس بات پر تو ہم سب متفق تھے کہ فیوڈل ازم تو ختم ہونا ہی چاہیئے۔ لیکن اس پر ہم میں سے کوئی بھی راضی نہیں تھا کہ مہاراجہ کو توہین آمیز طریقے سے ریاست سے نکالا جائے۔ اور ہم نے آپس میں یہ فیصلہ بھی کر لیا تھا کہ چونکہ کانفرنس میں اکثریت وادی کے ورکرز کی ہو گی اس لیے ہم کوئی ایسا مسئلہ نہیں اُٹھائیں گے، جس سے آپس میں تلخی پیدا ہو۔ ہم سب کا مقصد تو ایک ہی تھا۔ صرف طریقہ کار میں اختلاف تھا۔ اس بحث کے بعد گفتگو کئی دوسرے موضوع پر ہوتی رہی۔ ایک موضوع کھیر بھوانی مندر دیکھنے کا بھی تھا۔ گفتگو کا آغاز سبھاشنی نے کیا۔

"کیا یہ ممکن ہو سکے گا کہ ہم کھیر بھوانی مندر جا سکیں؟ میرے خادر نے خاص طور سے وہاں جانے کو کہا تھا۔"

"جانا تو میں بھی چاہتا ہوں۔" گندوترا نے سبھاشنی کی تائید کرتے ہوئے کہا، اور پھر سبھی ساتھیوں نے اسے سپورٹ کیا۔

"اس مندر کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ کھیر بھوانی دیوی پر صرف دُودھ ہی چڑھایا جاتا ہے اور یہ سارا دُودھ نیچے تالاب میں جمع ہوتا رہتا ہے۔"

"سارا تالاب دُودھ اور پھولوں سے بھرا رہتا ہے۔ لوگ سامنے کی کھلی جگہ پر بیٹھ کر بہت دیر تک پُوجا کرتے رہتے ہیں۔" میں نے شیل کی بات کی مزید وضاحت کی۔

"آپ دیکھ چکے ہیں وہ مندر؟" سبھاشنی نے پوچھا۔

"ہاں۔ بہت سال پہلے اپنے خادر کے ساتھ آیا تھا۔ وہاں کا واتاورن بھی بہت اچھا ہے۔"

"کیا یہ سچ ہے کہ جب کبھی کشمیر پر کوئی آفت آنے والی ہوتی ہے، تالاب میں بھرے

ڈودھ کا رنگ ایکدم کالا ہو جاتا ہے ؟ گندوترا نے پوچھا۔

"کہا تو یہی جاتا ہے۔ بلکہ یہاں کے کچھ لوگوں نے تو یہ بھی بتایا ہے کہ جب ڈیڑھ سال پہلے قبائلیوں نے وادی پر حملہ کیا تھا تو تالاب میں بھرا سارا دودھ بالکل سیاہ ہو گیا تھا۔"

"کیا یہ ٹھیک ہے؟" سبھاشنی نے بڑے اشتیاق سے پوچھا۔

"کہا تو یہی جاتا ہے۔"

"تو پھر ہم سب کو کھیر بھوانی لے چلیے۔"

"بشیر احمد سے کہوں گا۔ جانے کا انتظام کر دے۔"

رات کے کھانے کے بعد گندوترا، سبھاشنی اور دوسرے ساتھی سونے کے لیے دوسرے ہاؤس بوٹ میں چلے گئے۔ رمضان جُو، ذُون اور مبارک دیر تک ہم سے گپ شپ کرتے رہے اور راجہ یہیں سماوار میں تیار کر کے نمکین قہوہ پلاتا رہا۔

جمعہ کی کانفرنس میں بہت گرماگرمی ہوئی۔ شیخ صاحب نے کھُل کر اس بات کا تقاضا کیا کہ مہاراجہ ہری سنگھ کو فوراً دستبردار ہو جانا چاہیے اور یُوراج کرن سنگھ کو حکومت سونپ دینی چاہیے۔ شیخ عبداللہ نے مزید وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ یُوراج بھی صرف نام کا ہی ریاست جموں و کشمیر کا ہیڈ ہو گا تمام اختیارات تو شیخ صاحب کے پاس ہوں گے۔ کانفرنس میں موجود سبھی نمائندوں نے اس کی تائید کی صرف ہمارے ورکرز خاموش رہے۔

کانفرنس کے بعد میں نے شیخ صاحب سے کچھ سوال کیے تو وہ ناراض ہو گئے۔ وہ مہاراجہ کو ایک دن بھی ریاست میں نہیں دیکھنا چاہتے تھے۔ اس سلسلے میں وہ کسی قسم کے اختلاف راے کے اظہار کو سُننے کے لیے تیار نہ تھے۔ وہ ڈوگرہ راج کو ختم کرنے کے لیے ہر ممکن حربہ استعمال کرنے کو تیار تھے۔ جب میں نے انھیں جموں میں نیشنل کانفرنس کی تحریک کو مضبوط کرنے کی بات چلائی تو ان کا رویہ بہت حوصلہ افزا نہیں تھا۔ وہ سمجھتے تھے کہ جموں میں ہندو سبھائی اور پرجا پریشد کی قوتیں زیادہ مضبوط تھیں۔ انھوں نے یہ ذمہ داری ہم پر ڈال دی کہ ہم ان قوتوں کو کمزور کریں۔ ایک طویل گفت گو کے بعد وہ اس بات پر راضی ہوئے کہ اگر جموں کے تمام علاقوں سے ورکرز اکٹھا کر کے جموں میں نیشنل کانفرنس کا کوئی بڑا اجلاس منعقد کیا جاتے تو وہ اس میں تقریر کرنے کے لیے آجائیں گے اور جموں کے لوگوں کو اپنا ہم خیال بنانے کی کوشش کریں گے۔ اس کے بعد اُن سے مزید گفت گو نہ ہو سکی اور وہ چلے گئے۔ جموں سے آتے میرے سب ساتھی مایوس ہو گئے تھے۔

بشیر احمد ہمارے ساتھ آیا تھا۔ وہ بھی شیخ صاحب کے رویے اور ان کی اتنی جلد بازی سے خوش نہیں تھا لیکن یہ تمام پارٹی کا مسئلہ تھا جس میں اس کی ذاتی رائے کو کوئی اہمیت حاصل نہیں تھی۔ اس نے اس مسئلے پر زیادہ بات نہیں کی اور میں نے بھی یہ مناسب نہ سمجھا کہ اس موضوع کو زیر بحث لایا جاتے۔ اُس نے اگلے دن ہمیں اپنے گھر کھانے پر آنے کو کہا لیکن سوائے میرے اور کوئی تیار نہ تھا۔

ہاں اُس نے ہمیں کھیر بھوانی لے جانے کے لیے انتظام کرنے کی ذمہ داری اپنے سَر لے لی تھی۔ پروگرام یہ بنا کہ اگلے دن ہم لوگ کھیر بھوانی جائیں گے اور ڈُون اور مبارک دونوں ہمارے ساتھ چلیں گے۔

ہم لوگ بس ایک ہی دن اور سرینگر میں رُکے اور جموں کے لیے روانہ ہو گئے۔ رمضان جُو نے بہت بڑھیا قسم کا کھانا ہمیں بید کی بڑی سی ٹوکری میں ڈال دیا۔ پہلی شام کو شیل اور میں ڈُون کی ماں سے ملنے ان کے ڈونگے میں گئے۔ وہ بڑی شفقت سے پیش آئی۔ اس کے چہرے پر اب وہ پہلی سی رونق نہیں تھی۔ خاصی کمزور لگ رہی تھی۔ ڈُون نے بتایا کہ وہ کافی دنوں سے بیمار چل رہی تھی۔

سرینگر سے جموں جانے والی بس رات کو رام بن رُک گئی۔ بشیر احمد نے ڈرائیور سے کہہ دیا تھا کہ وہ راستے میں ہماری دیکھ بھال کرے۔ چنانچہ اس نے رام بن کے فارسٹ ریسٹ ہاؤس میں ہمارا انتظام کروا دیا۔ اور کھانا بھی ہمارے ساتھ ہی کھایا۔ گندوترا اور میں ریسٹ ہاؤس کے باہر بیٹھے بہت دیر تک باتیں کرتے رہے۔ کھُلے نیلے آسمان میں آدھا چاند چمک رہا تھا اور اِرد گرد ہلکی سی چاندنی پھیل رہی تھی، جس میں صرف نزدیک ہی کی چیزیں نظر آ رہی تھیں۔ پُل کے نیچے سے گزرتے ہوئے چناب کے پانی کے پتھروں سے ٹکرانے کا ہلکا ہلکا شور سُنائی دے رہا تھا۔ گندوترا اور میں دونوں ہی پست ہمت ہو گئے تھے۔ جس اُتساہ سے ہم لوگ سرینگر گئے تھے وہ ایکدم ٹھنڈا پڑ گیا تھا۔ شاید ایسی ہی کیفیت شیل اور سُبھاشنی کی بھی تھی۔ لیکن ہم ایکدوسرے سے بہت کھُل کر بات نہیں کر رہے تھے۔ ہم سب میں ایک ہچکچاہٹ اور جھجک تھی۔ جیسے کچھ نہ کچھ چھُپا رہے تھے ہم ایکدوسرے سے۔ ایکدوسرے کو اپنا راز دار نہیں بنا رہے تھے۔ جیسے اپنی اپنی جگہ ہم سب اپنے آپ کو قصوروار سمجھ رہے تھے۔ لیکن یہ بات واضح نہیں تھی کہ ہمارا قصور کیا تھا اور ہم کیوں اپنے آپ کو بغیر کسی وجہ کے قصوروار سمجھ رہے تھے۔

جموں پہنچے تو ہمیں یہ جان کر حیرت ہوئی کہ یہ خبر تو گھر گھر پھیل چکی تھی کہ مہاراجہ ہری سنگھ کو مجبور کیا جا رہا تھا کہ وہ اپنی ریاست کو چھوڑ کر چلا جاتے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ جو بات کچھ ہی روز پہلے سرینگر میں مجاہد منزل میں اُٹھائی گئی تھی، وہ ہمارے پہنچنے سے پہلے ہی یہاں پہنچ گئی تھی۔ لوگوں کے ردِ عمل مختلف تھے۔ کچھ لوگ اس خبر کو سُن کر خوش ہوتے تھے۔ کچھ لوگوں نے بڑی بے نیازی کے رویّے کا

کا اظہار کیا تھا۔ لیکن کچھ ایسے لوگ بھی تھے جنہیں اس خبر کو سن کر صدمہ ہوا تھا۔ اس آخری کیٹگری میں میرے والد اور پٹیل کی ماں شامل تھی۔ یہ ردِ عمل ذاتی قسم کے تھے اور یہ اُن لوگوں کے ردِ عمل تھے جنہیں ڈوگرہ راج سے گہری وابستگی تھی۔

میں، گندوترا، سبھاشنی اور ہمارے دوسرے ساتھی شیخ عبداللہ سے اختلاف کے باوجود اس کوشش میں جُٹ گئے کہ جموں میں نیشنل کانفرنس کا ایک جلسہ کیا جاتے۔ رسپونس بہت زیادہ نہیں تھا۔ لیکن اتنا اندازہ ہمیں ضرور ہوگیا تھا کہ ایک کامیاب جلسہ کیا جا سکتا تھا اور اس میں ہم شیخ صاحب کو بُلا سکتے تھے۔ ہم نے اپنی اس کوشش اور اپنے اس ارادے کے بارے میں بشیر احمد کو لکھ دیا اور اس سے یہ بھی کہا کہ وہ ہماری طرف سے شیخ صاحب سے بات کرے اور اطلاع دے کہ ہم یہ جلسہ کب کریں۔ ہم اس کے خط کا انتظار کرنے لگے۔ جب کئی دنوں تک بشیر احمد کا جواب نہیں آیا تو ہم نے یہ فیصلہ کیا کہ گندوترا خود سرینگر چلا جاتے اور بشیر احمد کو ساتھ لے کر شیخ صاحب سے ملے اور جلسے کی تاریخ طے کر کے آتے۔ لیکن حالات فوراً ہی بدل گئے۔

ہمیں معلوم ہوا کہ پنڈت جواہر لال نہرو نے مہاراجہ ہری سنگھ، مہارانی تارا دیوی اور یُوراج کرن سنگھ کو فوراً دہلی بُلوایا تھا۔ ظاہر تھا کہ مسئلہ بڑا گمبھیر تھا اور شیخ صاحب نے پنڈت نہرو کو مجبور کر دیا تھا کہ وہ ان کی مانگ کو پورا کرنے کے لیے فوری قدم اٹھائیں۔ بساط بچھ چکی تھی اب صرف مہروں کی چالیں چلائی جانی تھیں۔ دہلی کے اخباروں میں خبریں بڑی تفصیل سے چھپ رہی تھیں۔ ایک دن صبح صبح سبھاشنی مہاجن دہلی کا ایک اخبار لے کر آئی جس میں یہ خبر چھپی تھی کہ مہاراجہ ہری سنگھ اپنی مہارانی اور یُوراج کے ساتھ دہلی پہنچ گیا تھا۔ اور پنڈت نہرو سے ان کی اہم ملاقاتیں ہونے والی تھیں۔

"اب کیا ہوگا؟" سبھاشنی نے پوچھا۔

"پنڈت نہرو اور سردار پٹیل میں کنفرنٹیشن ہوگی۔"

"کون جیتے گا؟"

"پنڈت نہرو۔"

"سردار پٹیل مہاراجہ کا ساتھ نہیں دیں گے؟"

"زیادہ دیر تک نہیں۔"

"کیوں؟"

"شیخ صاحب کا پنڈت جی پر بڑا اثر ہے۔"

"اور سردار پٹیل کا؟"

"وہ مہاراجہ کی مدد کرنا چاہتے ہوئے بھی زیادہ مدد نہیں کر سکیں گے۔"

"تو ہوگا کیا؟" یہ سوال شیل کا تھا۔

"دونوں طرف سے کھینچا تانی چلتی رہے گی اور آخر میں جو فریق کمزور ہوگا وہ ہار جائے گا۔"

"دونوں میں سے کون فریق کمزور ہے؟"

"مجھے تو سردار پٹیل ہی لگتا ہے۔"

"پنڈت نہرو نہیں؟"

"نہیں۔"

"کیوں؟"

"کچھ دنوں میں خود ہی معلوم ہو جائے گا۔" میں یہ جواب دے کر خاموش ہو گیا۔ میں اس بحث کو طول دینا نہیں چاہتا تھا۔

میرا جی تو چاہتا تھا کہ میں خود ہی دہلی جاؤں اور اس سارے ڈرامے کو نزدیک سے دیکھوں لیکن شیل کی ڈلیوری ہونے والی تھی اور میں اُسے اِس حالت میں اکیلا نہیں چھوڑ سکتا تھا۔ چنانچہ میں نے دہلی کے ایک جرنلسٹ کو لکھا کہ وہ حالات پر نظر رکھے اور مجھے ہر ڈی ویلپمینٹ کے بارے میں اطلاع دیتا رہے۔ تھوڑے ہی دنوں بعد اس کا ایک خط آیا۔

"ایسا لگتا ہے کہ مہاراجہ ہری سنگھ کے ستارے زوال پر ہیں۔ اس کے باوجود اس میں جو شاہانہ وقار ہے اس کا میں قائل ہو گیا ہوں۔ پنڈت نہرو کی اور مہاراجہ کی آپس میں کوئی زیادہ دوستی نہیں لگتی۔ اُس نے فیصلہ سردار پٹیل پر چھوڑ دیا ہے لیکن فیصلہ کیا ہونا چاہیئے، اس کی طرف اشارہ بھی کر دیا ہے پنڈت جی نے۔ سُنا ہے آج مہاراجہ ہری سنگھ، اس کی مہارانی اور یُوراج، سردار پٹیل کے ہاں رات کے کھانے پر مدعو ہیں۔ لگتا ہے مہاراجہ کی تقدیر کا فیصلہ آج رات ہی ہو جائے گا۔ کل کے اخباروں میں تو شاید کچھ زیادہ نہیں آئے گا لیکن میں تمہیں کل دوبارہ خط لکھوں گا اور تازہ ڈی ویلپمینٹ سے مطلع کروں گا۔"

میرے جرنلسٹ دوست کے دوسرے خط نے معاملہ صاف کر دیا۔

"سردار پٹیل نے مہاراجہ کو صاف صاف کہدیا ہے کہ اُسے ریاست کو چھوڑنا ہی پڑے گا

حالانکہ شیخ عبداللہ چاہتا ہے کہ وہ دستبردار ہو جاتے۔ فیصلہ یہ ہوا کہ مہاراجہ اور مہارانی
کچھ مہینوں کے لیے ریاست سے باہر چلے جائیں اور یُوراج کو ریجینٹ مقرر کر دیں، جو
مہاراجہ کی غیر حاضری، میں اس کی ذمہ داریاں اور فرائض منصبی نبھاتے۔ خبر یہ ہے کہ مہاراجہ
نے ابھی اپنی رضامندی کا اظہار نہیں کیا اور وہ اپنے ایڈوائیزرز بخشی ٹیک چند اور مہر چند
مہاجن سے مشورہ کرنے کے بعد ہی کوئی جواب دے گا۔ یہ بھی خبر ہے کہ یُوراج کرن سنگھ
پر دباؤ ڈالا جا رہا ہے کہ وہ ریجینٹ کا عہدہ سنبھالنے سے انکار کر دے۔ صحیح بات
تو کچھ دنوں بعد معلوم ہو گی کیونکہ سردار پٹیل کی صحت اچھی نہیں اور وہ ڈیرہ دون چلے
گئے ہیں۔ میرے اگلے خط کا انتظار کرو۔"

اگلے روز کے اخباروں میں اِسی قسم کی خبریں چھپی تھیں۔ میرے دوست کی بات کی تصدیق ہوگئی تھی۔ پھر کئی
دنوں تک اخباروں میں قیاس آرائیاں ہوتی رہیں لیکن ٹھیک بات معلوم نہ ہو سکی۔ پھر ایک دھماکہ خیز خبر
چھپی۔ مہاراجہ ہری سنگھ اور مہارانی تارا دیوی ریاست جموں کشمیر کو چھوڑ کر جا رہے تھے اور یُوراج کرن سنگھ
ریجینٹ کا عہدہ سنبھالنے پر راضی ہو گیا تھا۔

اس خبر کی تفصیل میرے جرنلسٹ دوست نے مجھ تک ۲۰ جون ۱۹۴۹ء کے اپنے خط میں پہنچائی
اور لکھا کہ مہاراجہ اپنے سٹاف اور ملازموں کے ساتھ صبح کی ٹرین سے بمبئی چلا گیا تھا اور مہارانی اپنے بھائی
اور نوکرانیوں کے ساتھ کار میں کسولی کے لیے روانہ ہو گئی تھی۔ اس نے یہ بھی لکھا تھا کہ اُسی دن یُوراج کرن سنگھ
بھی ہوائی جہاز سے سرینگر کے لیے روانہ ہو جاتے گا۔

اس نے اپنے خط میں اس فرمان کا بھی ایک تراشا بھیجا تھا جو بمبئی جانے سے پہلے مہاراجہ نے دہلی
سے جاری کیا تھا۔

PROCLAMATION

Whereas I have decided for reasons of health to leave the State for a temporary period and to entrust to the Yuvaraj Shri Karansinghji Bahadur for that period all my powers and functions in regard to the Government of the State.

Now, therefore, I hereby direct and declare that all powers and functions, whether legislative, executive, or judicial which are exercisable by me in relation to the State and its Government, including in particular my right and prerogative of making laws, of issuing Proclamations, Orders and of pardoning offenders, shall during the period of my absence from the State be exercisable by the Yuvaraj Shri Karansinghji Bahadur.

Hari Singh
MAHARAJADHIRAJ

اسی نوعیت کی خبریں سبھی اخباروں میں بھی چھپ گئی تھیں۔ مجھے لگا کہ سو سال پہلے مہاراجہ گلاب سنگھ نے جو درخت لگایا تھا۔ اب وہ ایک زوردار طوفان سے اُکھڑ کر گر گیا تھا۔ ڈوگرہ راج ریاست جموں کشمیر سے ختم ہو گیا تھا۔

فیوڈل ازم کے خلاف پورا جہاد کرنے کے باوجود میں اس طریقہ کار کی حمایت نہ کر سکا، جو اُسے مٹانے کے لیے اختیار کیا گیا تھا۔ یہ یقیناً شیخ عبداللہ کی ذاتی فتح تھی۔

دو دن کے بعد یُوراج کرن سنگھ نے اپنے نئے عہدے کا حلف لیا اور اُسی رات شیل نے ایک خوبصورت بیٹے کو جنم دیا۔ مجھے بھی میرا جانشین مل گیا تھا، حالانکہ میرے پاس اُسے دینے کو کچھ بھی نہیں تھا۔ سوائے کچھ قدروں کے اور اصولوں کے، جن کی آج کی دنیا میں کوئی قیمت نہیں ہے۔

ہم دونوں نے اتفاق رائے سے اپنے بیٹے کا نام سرفراز رکھ دیا۔ شاید یہ ہماری تشنہ آرزوؤں کی ایک تحت الشعوری کوشش تھی۔ اپنے آپ کو اس بات کا یقین دلانے کی کوشش کہ ابھی ہم پوری طرح نہیں ہارے تھے۔

۸

ریاست جموں کشمیر کے حالات بڑی تیزی سے بدل رہے تھے۔ شیخ صاحب کی ساری توجہ وادی کی طرف تھی اور ان کا دھیان صرف ایک نقطے پر مرکوز تھا کہ وہ کس طرح سے ریاست کے مالکِ کُل بن سکتے تھے اور یُوراج کو کس طرح سے بالکل بے اختیار کیا جا سکتا تھا۔ جموں کو انھوں نے پرجا پریشد کا ایک مضبوط گڑھ سمجھ لیا تھا، پریم ناتھ ڈوگرہ جس کے لیڈر تھے اور یہ حقیقت تھی کہ جموں کے زیادہ تر لوگ ان کی آواز کو پہچانتے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا تھا کہ ہم اپنی کوششوں کے باوجود نیشنل کانفرنس کو زیادہ مضبوط نہیں بنا سکے تھے۔ اس کی ایک بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ وادی کی لیڈرشپ کی ہمیں کوئی خاص سرپرستی حاصل نہیں تھی۔ خالی خولی ہمدردی تھی۔ لیکن سیاسی تحریکیں صرف ہمدردیوں سے طاقت حاصل نہیں کرتیں، عمل سے کرتی ہیں۔ اس لیے ہمارے ساتھیوں کا حوصلہ کمزور ہو گیا تھا۔ اِدھر پرجا پریشد والے اپنی شناخت بنانے کی کوشش میں تھے اُدھر مسلم کانفرنس کے لیڈر اپنی ساکھ مضبوط کرنے کا جتن کر رہے تھے۔ لہٰذا قومی تحریک کو مضبوط کرنے کی کوشش کرنے والے ہم جیسے لوگ بہت پست ہمت ہوتے جا رہے تھے۔

انہی دنوں یُوراج کرن سنگھ کا سرینگر سے کچھ دُور ایک حادثہ ہو گیا تھا۔ وہ چکور کے شکار پر اپنے ہمراہیوں کے ساتھ کار میں جا رہا تھا کہ ایک ٹرک بُری طرح اس کے کار سے ٹکرایا اور یُوراج کی بائیں ٹانگ بُری طرح سے ٹوٹ گئی۔ لگتا تھا کہ یُوراج کرن سنگھ کے ستاروں میں حادثوں کا بہت دخل تھا۔ اس سے پہلے اس کی دائیں ہپ بون نے اسے بڑی اذیت دی تھی۔ بے چارہ چھ مہینوں تک پلستر لگوا تے بستر پر پڑا رہا تھا اور ناقابل برداشت اذیت سہتا رہا تھا۔ جب یہاں کچھ نہ ہو سکا تو اسے امریکہ بھیجنا پڑا، جہاں وہ نیو یارک کے ہاسپٹل فار سپیشل سرجری میں تقریباً سال بھر ڈاکٹر فلپ ولسن کے زیرِ علاج رہا اور بڑی کوششوں کے بعد ٹھیک ہوا۔ اور یہ عجیب اتفاق تھا کہ کشمیر کے شاہی خاندان کے آخری نمائندے کو یہ حادثہ پانڈریتھن کے شومندر کے قریب پیش آیا تھا، جس مقام پر راجہ پرورسین نے کئی صدیاں پہلے سرینگر کی بنیاد رکھی تھی اور اسے اپنی راجدھانی بنایا تھا۔ کشمیر کے پہلے راجے اور اس کے شاہی خاندان کے آخری نمائندے کا پانڈریتھن سے یہ تعلق مجھے بڑا حیرتناک لگا۔ جانے کیوں مجھے اس بات کا یقین ہو گیا کہ کشمیر سے بادشاہت کا دور اب ختم ہو کر ہی رہے گا۔ اس حادثے کے بعد مہاراجہ ہری سنگھ نے یُوراج کو بمبئی لے جانے پر اصرار کیا، جہاں وہ کئی مہینے زیرِ علاج

رہا اور جب اس کے ٹانگ کی ہڈیاں ٹھیک طرح سے آپس میں نہ جُڑ سکیں تو اس کا اوپریشن ہوا اور دائیں ٹانگ کے اندر میٹل سٹرپ ڈالا گیا اور دونوں ٹانگوں کو متوازن رکھنے کے لیے بائیں ٹانگ میں چھ پیچ لگائے گئے۔ اُدھر یُوراج مصیبتیں جھیل رہا تھا اِدھر ریاست میں شیخ عبداللہ اور ان کے نائب بخشی غلام محمد سیاسی سرگرمیوں میں مصروف تھے۔

ایک عجیب گھٹنا یہ بھی ہوئی کہ ابھی یُوراج کرن سنگھ پوری طرح صحت یاب بھی نہ ہُوا تھا کہ اُس کی شادی کی تاریخ طے ہوگئی۔ شادی بھی مارچ کے پہلے ہفتے میں ہوئی، جب کہ اس کا جنم بھی مارچ کے اسی ہفتے میں ہُوا تھا۔ شادی نیپال کے جنرل شارداشمشیر کی سب سے بڑی بیٹی یاشوراجیہ لکشمی سے ہوئی، جس کی عمر شادی کے وقت صرف تیرہ برس تھی۔ مہاراجہ ہری سنگھ اور مہارانی تارا دیوی نے شادی بڑی دھوم دھام سے کی جس میں بڑی بڑی شخصیتیں شامل ہوئیں۔ شادی کے کوئی چھ مہینے بعد یُوراج کرن سنگھ اپنی یُورانی کے ساتھ جموں پہنچا تو شہریوں نے ان دونوں کا بڑا ہی پرتپاک استقبال کیا۔ سارا شہر یُوراج کے خیرمقدم کے لیے راستوں پر موجود تھا۔ اس بھیڑ میں میرے علاوہ شیل، سُبھاشنی اور گندوترا بھی موجود تھے۔ سُبھاشنی نے جب پھولوں کا ہار یُورانی کی طرف بڑھایا تو اس نے مُسکرا کر لے لیا۔ یُورانی تو بالکل ایک خوبصورت گڑیا سمان لگ رہی تھی۔ جب ہم استقبال کے بعد ریزیڈینسی روڈ کی طرف سے گھر آ رہے تھے تو سُبھاشنی نے کہا۔

"شاہی خاندانوں میں بھی لڑکیوں کی اتنی چھوٹی عمر میں شادی کر دی جاتی ہے؟"

"اس لیے کہ وہ بڑی ہو کر اپنے ماں باپ کی مرضی کے خلاف شادی نہ کر سکیں"، شیل نے جواب دیا۔

"مگر ہمارا دولھا بھی تو کم سن ہے۔" میں نے کہا۔

"بڑا ہوتا تو اپنی پسند کا اظہار کرتا۔"

"گندوترا" "اصل بات یہ ہے کہ دونوں کے ماں باپ نے یہ شادی طے کی ہے۔ اس لیے یہاں پسند کا مسئلہ ہے ہی نہیں۔"

"تو پھر اور کون سا مسئلہ ہے؟" سُبھاشنی نے سوال کیا۔

"دونوں شاہی خاندانوں کے آپسی رشتے کو مضبوط کرنے کا سوال تھا۔"

"تو وہ حل ہو گیا کیا؟"

"بڑے مناسب ڈھنگ سے۔" میں نے جواب دیا۔

"شادی بیاہ کے مسئلے اتنی جلدی اور خوبصورتی سے طے نہیں ہوتے۔"
"تمہارا مسئلہ تو بڑی آسانی سے طے ہو گیا تھا" شیل نے مسکراتے ہوتے کہا
"کیونکہ تم بڑی اُتاولی تھیں۔" میرے اس جواب پر سبھی ہنس دیے۔ خاص طور پر گندوترا جس نے ہمارے سرینگر بھاگ جانے کے لیے روپے پیسے کا انتظام کیا تھا۔

ہمارے گھر کے سامنے کچھ دیر گپ شپ کے لیے سب لوگ رُکے اور پھر دھیرے دھیرے سب دوست اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے۔

اگلے دن شیخ صاحب سرینگر سے جموں آتے اور یوُراج اور یوُرانی کے اعزاز میں منڈی مبارک کے پُرانے محل میں شاندار استقبالیہ دیا۔ سرینگر سے نیشنل کانفرنس کے کچھ اہم کارکن بھی آتے تھے۔ بشیر احمد بھی آگیا تھا۔ اس کا مقصد تو صرف ہم لوگوں سے ملنا تھا۔ اُس کا اس طرح اچانک آنا ہمیں بہت اچھا لگا۔ حیرت کی بات تھی کہ شیخ صاحب نے جموں کے اپنے کسی ورکر کو اپنی آمد کی اطلاع نہیں دی تھی۔ میں تو خیر اپنی ذاتی حیثیت سے وہاں تھا، چونکہ میرے والد بھی انتظامات کے سلسلے میں وہاں موجود تھے۔ اس لیے میں بغیر ان سے ملے واپس آگیا تھا۔ یہ اچھا ہوا تھا کہ شیل میرے ساتھ نہیں آئی تھی۔ ہم دونوں کا خیال تھا کہ مجھے اکیلے ہی تقریب میں جانا چاہیے۔ میں گھر واپس پہنچا تو بشیر احمد موجود تھا۔

"تو تم اپنے راجہ کے استقبالیہ میں گئے تھے؟"
"ہاں۔ لیکن استقبالیہ سے پہلے ہی لوٹ آیا۔"
"کسی نے گھاس نہیں ڈالی؟" شیل نے طعنہ کسا۔
"ڈالی تو تھی لیکن سُوکھی تھی۔ قبول نہیں کی واپس آگیا۔"
"تم نے اپنے آنے کی اطلاع تو دی ہوتی، بشیر۔"
"یار اچانک ہی پروگرام بن گیا۔ اصلی مقصد تو تم سے ملنا تھا۔"
"کیا نیشنل کانفرنس کو یہاں ختم کرنا چاہتے ہو تم لوگ؟"
"کیا بتاؤں۔ شیخ صاحب کے سامنے تو آج کل ون پوائنٹ پروگرام ہے۔ تم لوگ کل صبح اُن سے ملتے کیوں نہیں؟"
"کچھ فائدہ ہوگا؟"
"کہہ نہیں سکتا۔" بشیر احمد نے جواب دیا۔

"میرے خیال سے تو کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔" شیل بولی۔

"لیکن انھیں یہاں کے ورکرز کے حالات کا تو علم ہو جاتے گا۔ میں بھی ساتھ رہوں گا۔"

"ٹھیک ہے میں اپنے ساتھیوں کو اطلاع کر دیتا ہوں۔"

بشیر احمد رات کو ہمارے ہی پاس رہا۔ میں نے گسندرتا اور سبھاشنی مہاجن کو بھی بُلوا لیا تھا۔ بشیر نے بتایا کہ رمضان جو آج کل پریشان تھا کیونکہ ڈُون کی ماں زیادہ بیمار تھی البتہ ڈُون اپنے گھر میں خوش تھی، اور مبارک نے شال باشی کا کام بھی شروع کر دیا تھا اور اس میں اُسے اچھا فائدہ ہو رہا تھا۔ مبارک نے شیل کے لیے بڑا ہی خوبصورت شال تیار کروایا تھا۔ اگر بشیر اس سے مل کر آتا تو وہ شیل کو پریزنٹ کرنے کے لیے وہ شال اُسے ضرور دیتی۔ لیکن وقت کی کمی کی وجہ سے وہ نہ مبارک کو مل سکا تھا نہ ڈُون کو۔

اگلے دن بشیر احمد نے ہم سب کو شیخ صاحب سے بلوایا۔ اُن سے مختصر سی گفتگو بھی ہوئی۔ لیکن اُن کا دھیان کتنی دوسرے مسئلوں کی طرف تھا اس لیے وہ ہماری بات پر زیادہ توجہ نہ دے سکے۔ مجھے لگا کہ ان کی زیادہ دلچسپی بھی نہیں تھی ہم لوگوں میں۔ بس اتنا ہوا کہ انھوں نے بشیر احمد سے کہا کہ وہ ہم میں سے کچھ ساتھیوں کو سرینگر بلالے۔ وہاں تفصیل سے بات ہو سکے گی۔ لیکن اس سے ہم میں سے کسی کی بھی تسلی نہ ہوئی۔ اس کے بعد بشیر احمد سرینگر سے آتے اپنے ساتھیوں میں شامل ہو گیا، کیونکہ وہ لوگ اُسی دن واپس جانا چاہتے تھے۔

شیل اور میں جب گھر پہنچے تو ہمارے ذہنوں پر ایک عجیب قسم کا بوجھ تھا۔ ایک بے دلی کی سی کیفیت تھی۔

شیل اپنی ذہنی پریشانی کو زیادہ دیر برداشت نہ کر سکی۔ اُدھر سرفراز کی طبیعت بھی پچھلے دو تین روز سے ٹھیک نہیں تھی۔

"کیا تم لیڈری کا یہ چکر چھوڑ نہیں سکتے؟"

"میں تو خود پریشان ہوں شیل۔"

"تم جرنلزم کی طرف کیوں دھیان نہیں دیتے۔ سیاست میں کیوں وقت برباد کر رہے ہو؟"

"ریاست کا جرنلزم بھی تو بے کار ہے۔ کیا معیار ہے یہاں کے اخباروں کا؟"

"کون پڑھتا ہے یہاں کے اخبار۔ کچھ شیخ صاحب کے حامی، اور کچھ وہ جنھیں اُن سے اختلاف ہے۔ پڑھے لکھے لوگ تو باہر کے اخبار پڑھتے ہیں۔"

"تو بتاؤ کیا کروں؟"

"دہلی میں تمہارے اتنے جرنلسٹ دوست ہیں۔ وہاں کے اخباروں سے وابستہ ہو جاؤ۔"

"ہمارے ساتھیوں کا کیا ہو گا شیل؟ وہ تو سمجھیں گے میں نے انہیں دھوکا دیا ہے۔"

"کوئی ایسا نہیں سمجھے گا۔ سبھاشنی تو دہلی یونیورسٹی میں لاڈیپارٹمینٹ میں ایڈمیشن لینے کی سوچ رہی ہے۔ اس کے خاوند اس سے ناراض ہیں۔"

"اور گندروترا؟"

"وہ اپنے کاروبار کو بڑھانا چاہتا ہے۔ صرف تمہاری طرف دیکھ رہے ہیں سب۔ تم کوئی فیصلہ کرو تو وہ بھی اپنے بارے میں سنجیدگی سے فیصلہ کریں۔"

"مجھے ایک بار سرینگر ہو آنے دو پھر فیصلہ کریں گے۔ اس بارے میں بخشی غلام محمد سے بھی ملنا چاہتا ہوں۔"

"تم جیسا ٹھیک سمجھو کرو۔ میں تو ہر حال میں تمہارے ساتھ ہوں۔ میری فکر نہ کرو۔"

"یہی اعتماد تو مجھے زندہ رکھے ہوتے ہیں، میری جان۔" میں نے پیار سے شیل کو اپنی باہوں میں لے لیا اور اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اندر کا لاوا ٹھنڈا ہو کر باہر نکلنے لگا تھا۔

اُس رات اُس نے مجھے چند دن پہلے کا ایک ایسا واقعہ سُنایا جس کے بارے میں مجھے علم نہیں تھا۔ اسی نوعیت کا ایک واقعہ وہ مجھے سُنا بھی چکی تھی۔

سرفراز کے جنم کی خبر تو میں نے ماں کو بھجوا دی تھی اور اس کے بعد وہ ہمارے گھر آئی بھی تھی۔ وہ شیل کو سلک کی ایک بہت عمدہ ساڑھی اور گلے کا ایک بہت ہی قیمتی ہار دے گئی تھی۔ شیل نے بغیر کسی پس و پیش کے یہ دونوں چیزیں لے لی تھیں اور ماں کے پاؤں چھوتے تھے۔ ماں نے اُسے بار بار کہا تھا کہ اگر میں اپنے ماں باپ کے گھر نہیں جانا چاہتا تو نہ جاؤں لیکن شیل کو تو کبھی کبھی وہاں جانا چاہیئے تھا۔ جب وہ میری ماں اور اپنی ماں کا مقابلہ کرتی تھی تو اسے ہمیشہ لگتا تھا کہ میری ماں اُس کی ماں سے بہتر تھی۔ لیکن میں کبھی اس معاملے میں شیل سے بات نہیں کرتا تھا۔ بہر حال میں نے اس کا بُرا نہیں مانا تھا کہ شیل نے میری ماں سے سرفراز کے جنم پر کچھ لیا تھا اور نہ ہی میں نے ساڑھی اور ہار کو دیکھنے کی خواہش ہی ظاہر کی تھی۔ لیکن شیل نے دونوں ہی چیزیں مجھے دکھائی تھیں اور ہار تو میرے سامنے پہنا بھی تھا۔ اب یہ میری کم ظرفی تھی کہ میں نے اپنی ماں کی دی ہوئی چیزوں کی تعریف تک نہ کی تھی۔

یہ واقعہ تو میرے علم میں تھا لیکن دوسرا واقعہ بعد کا تھا اور اس کا علم مجھے نہیں تھا۔

ایک دن دوپہر سے پہلے شیل اپنی ماں سے ملنے گئی تھی۔ بہت تھوڑی دیر کے لیے گئی تھی، صرف اُسے دیکھنے کے لیے۔ اُس کے والدین کو سرفراز کے جنم کی خبر مل چکی تھی اور وہ بہت خوش بھی تھے۔ ماں کی صحت اب اچھی ہو رہی تھی اور وہ گھر میں اِدھر اُدھر بنا سہارے کے، تھوڑی دیر چل پھر بھی لیتی تھی۔ وہ اسے اپنے کمرے میں چھوڑ کر دوسرے کمرے میں گئی اور تھوڑی دیر کے بعد اس کی چہیتی نوکرانی گلابو چاندی کے ایک تھال میں کچھ نوٹ، کچھ زیورات اور کپڑوں کا ایک جوڑا لے کر آئی اور ماں نے وہ تھال شیل کو پکڑا دیا۔ شیل نے وہ تھال ماں کے پلنگ کی پائینتی رکھ دیا۔ اور اسے لینے سے انکار کر دیا۔ اس نے کہا کہ وہ صرف ماں کا حال پوچھنے آئی تھی۔ ماں کے بے حد اصرار کے باوجود شیل نے تھال میں رکھی چیزوں میں سے ایک بھی چیز کو لینے سے انکار کر دیا اور واپس چلی آئی۔ اُسی شام کو ماں نے اپنے ایک ملازم کے ہاتھ ایک چھوٹے سے بکسے میں پہلے سے کہیں زیادہ روپے اور زیور اور کپڑے ڈال کر ہمارے گھر بھجوا دیے۔ شاید ماں نے یہ سوچا تھا کہ جو کچھ اُس نے صبح شیل کو دیا تھا وہ کم تھا اور اسی لیے وہ سب کچھ وہیں چھوڑ آئی تھی۔ پھر ہم لوگوں کی مالی حالت کا بھی تو اسے علم تھا۔ اسی لیے اس نے خاصا کچھ بھجوایا تھا۔ شیل پر اس کا ردِعمل اُلٹا ہوا۔ اس نے خیال کیا کہ اس کی ماں نے اس پر ترس کھا کر اسے زیادہ مالیت کی چیزیں بھجوائی تھیں۔ اس نے ملازم کو ڈانٹ دیا تھا اور کہا تھا کہ ہم لوگ بھکاری نہیں تھے، جن کا گزارہ خیرات پر چل رہا ہو۔ اس نے ملازم کو باہر سے ہی لوٹا دیا تھا اور کہا تھا کہ وہ رانی صاحبہ کو کہہ دے کہ اس کے بعد وہ کسی کو ہمارے گھر نہ بھیجیں۔

میں نے یہ واقعہ سنا تو مجھے افسوس ہوا۔

"ایک آدھ چیز رکھ لیتیں تو ماں کی عزت رہ جاتی۔"

"ماں نے مجھے ذلیل کرنے کی کوشش کی تھی۔"

"میں تم سے متفق نہیں۔"

"تو تم چلے جاؤ۔ ابھی تک ماں نے سب کچھ الگ رکھا ہوگا۔ لے آؤ سارا سامان۔"

"اگر تم نے میری ماں کی چیزیں قبول کر لی تھیں تو اپنی ماں کی دی ہوئی چیزوں کو لینے میں کیا اعتراض تھا تمہیں؟"

"ایک طرف پیار تھا۔ دوسری طرف اپمان تھا۔ میں اپنی ماں کو تم سے زیادہ اچھی طرح جانتی ہوں۔"

"یہ مجھے معلوم ہے۔"

"ہماری مالی حالت کمزور ہے تو اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ ہم خیرات وصول کرتے پھرتے ہیں۔"

میں نے شیل سے بحث نہیں کی۔ لیکن ایک بات کا مجھے پوری طرح یقین ہو گیا تھا کہ وہ میرا ساتھ دینے میں ٹوٹ تو سکتی تھی لیکن کہیں جھک نہیں سکتی تھی، چاہے وہ اس کی ماں کا ہی دروازہ کیوں نہ ہو۔ جس کے خاندان کی روایات یہ تھیں کہ لڑکی کی جب ڈولی اٹھ جاتے تو پھر وہ زندہ اُس گھر میں واپس نہیں آسکتی۔ وہ اپنے خاندان کی روایات کی پاسداری کرے گی اِس کا مجھے بھرپور یقین ہو گیا تھا۔

میرا سرینگر جانے کا پروگرام کینسل ہو گیا تھا۔

بخشی غلام محمد جو ان دنوں نا تب وزیر اعظم تھا، اچانک جموں آگیا تھا۔ بخشی کا جموں کے شہریوں سے اچھا رابطہ تھا۔ اس نے اپنے دو روز کے قیام کے دوران سبھی معزز شہریوں سے ملاقاتیں کیں۔ ایک جلسے میں بھی تقریر کی۔ مجھے لگا کہ بخشی جموں والوں سے بے توجہی برتنا نہیں چاہتا تھا۔ ایک صبح اُس سے میری ملاقات ہوتی۔ جموں میں نیشنل کانفرنس کو مضبوط کرنے کی بھی بات کی اور اس علاقے کے مجموعی مسائل کو بھی اس کے سامنے رکھا۔ گفت گو کے دوران یہ اندازہ ہوا کہ بخشی کو بھی شیخ صاحب کے طریقہ کار سے اختلاف تھا اور اس کا اظہار بھی وہ اُن سے کرتا رہتا تھا۔ اُن دونوں رہنماؤں کے آپسی اختلافات رفتہ رفتہ بڑھتے گئے، جنہیں کھُل کر سامنے آنے میں کچھ وقت لگا اور جس کے نتائج غیر متوقع تھے۔ بہرحال جموں میں نیشنل کانفرنس کا مستقبل کوئی خاص روشن نہیں تھا۔ لیکن بخشی سے ملاقات کے بعد ایسا محسوس ہوا کہ ابھی کچھ عرصہ مجھے سیاست میں ہی رہنا چاہیئے۔ ہاں اس کے ساتھ ساتھ مجھے جنرل زم سے اپنا رشتہ زیادہ مضبوط کرنا چاہیئے اور اس کے لیے مجھے سرینگر کے کم اور دہلی کے زیادہ چکر لگانے چاہئیں۔ ریاست کے سیاسی حالات میں بہت رد و بدل ہو رہا تھا۔

۱۳ جولائی ۱۹۳۱ء کو شیخ صاحب کی تشکیل کی گئی مسلم کانفرنس نے ڈوگرہ راج کے خلاف تحریک کا آغاز کیا تھا۔ جوش و خروش کے دوران جلوس میں سے کچھ لوگوں نے ہندو دکانداروں پر حملہ کر دیا۔ ڈوگرہ پولس نے گولی چلائی جس میں کچھ کشمیری مسلمان ہلاک ہو گئے۔ جب سے نیشنل کانفرنس وجود میں آئی تھی، ہر سال ۱۳ جولائی کے دن کو یوم شہیداں کے طور پر منایا جا رہا تھا۔ شیخ صاحب اس سال یوم شہیداں کے دن ریاست میں جاگیرداری کو ختم کرنے کا اعلان کرنا چاہتے تھے۔ اس اعلان کو دستخطوں کے لیے یُوراج کرن سنگھ کے پاس کئی روز پہلے بھیجا گیا تھا۔ یُوراج اس کے حق میں نہیں تھا۔ لیکن اس نے گورنمنٹ آف انڈیا سے صلاح مانگی تھی۔ شیخ صاحب اس بات سے

بہت ناراض تھے اور انھوں نے یوراج کو بڑے سخت قسم کے خط لکھے تھے۔ گورنمنٹ آف انڈیا نے مشورہ دیا تھا، کیوں کہ اس معاملے کے دُور رس ردِعمل ہو سکتے تھے، اس لیے جلدی میں کوئی فیصلہ نہ کیا جاتے۔ چنانچہ یوراج نے اس اعلان پر دستخط نہیں کیے تھے۔ لیکن شیخ صاحب نے اس حقیقت کی پرواہ نہ کرتے ہوتے یومِ شہیداں کے موقع پر جاگیرداری کو ختم کیے جانے کا اعلان کر دیا۔ شیخ صاحب کا یہ پہلا عمل تھا جس سے ان کے اور گورنمنٹ آف انڈیا کے آپسی اختلافات کا آغاز ہوا، بعد میں جس کے بڑے ہی اہم نتائج سامنے آتے۔ اسی دوران سردار پٹیل کا انتقال ہو گیا اور اس طرح یوراج کرن سنگھ کا ایک بہت ہی مضبوط صلاح کار اور سرپرست اُسے چھوڑ گیا۔

اور پھر آئین ساز اسمبلی کے انتخابات ہوتے جس میں پچھتر[۷۵] ممبروں میں سے نیشنل کانفرنس کے تہتر[۷۳] ممبر بلا مقابلہ کامیاب ہو گئے۔ شیخ صاحب کی یہ بہت بڑی فتح تھی۔ اسمبلی کے افتتاحی اجلاس میں شیخ صاحب نے بڑی سخت قسم کی تقریر کی اور مہاراجہ کے خلاف اپنے غم و غصہ کا بڑے ہی سخت الفاظ میں اظہار کیا۔ دہلی کے اخبارات میں اس تقریر کے کچھ حصے شائع ہوتے تھے۔

تقریر کے مندرجہ ذیل حصے میں شیخ صاحب نے بڑی سخت بات کہی تھی۔

After the attainment of complete power by the people, it would have been an appropriate gesture of goodwill to recognize Maharaja Hari Singh as the first Constitutional Head of the State. But I must say with regret that he has completely forfeited the confidence of every section of the people. His incapacity to adjust himself to changed conditions and his antiquated views on vital problems constitute positive disqualifications for him to hold the high office of a democratic Head of the State.

شیخ صاحب نے ڈوگرہ راج کو ختم کر دینے کا اعلان کر دیا تھا۔

شیخ صاحب اب یہ چاہتے تھے کہ یُوراج کرن سنگھ صدر ریاست کا عہدہ سنبھالنے کے لیے اپنی رضامندی کا اظہار کرے ورنہ وہ آئین ساز اسمبلی کے ذریعہ ریاست کے کسی بھی آدمی کا انتخاب کر کے اسے صدر ریاست بنا دیں گے۔ یُوراج کی پوزیشن بڑی عجیب تھی۔ ادھر شیخ صاحب کا اصرار تھا کہ وہ انھیں اپنے فیصلے سے فوراً آگاہ کرے اُدھر مہاراجہ ہری سنگھ اپنے دوستوں کے ذریعہ یُوراج پر دباؤ ڈال رہا تھا کہ وہ شیخ صاحب کی اس پیش کو کسی بھی قیمت پر قبول نہ کرے۔ اگر وہ اپنے پِتا کی بات مانتا ہے تو اس کا یہ مطلب ہوگا کہ وہ ریاست جموں کشمیر سے مستقل طور پر اپنا رشتہ توڑ لے اور مہاراجہ کی طرح ریاست چھوڑ کر چلا جائے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اس کے خاندان کے کسی بھی آدمی کا ریاست سے کوئی واسطہ نہیں ہوگا اور رفتہ رفتہ مہاراجہ کی اور یُوراج کی تمام ذاتی جائداد اور ٹرسٹ پر شیخ صاحب کی حکومت کا قبضہ ہو جائے گا۔ اب یا تو یُوراج اپنے والد کو ناراض کر دے اور خود کو حالات کے حوالے کر دے یا پھر اُسی توہین آمیز طریقے سے ریاست کو چھوڑنے پر مجبور ہو جاتے جس طرح مہاراجہ ہری سنگھ مجبور ہوا تھا۔ سردار پٹیل کے انتقال کے بعد اب سوائے پنڈت نہرو کے کوئی ایسا شخص نہیں تھا جس پر وہ اپنے ذاتی مسئلوں کے حل کے لیے بھروسہ کر سکے۔ چنانچہ اس نے پنڈت نہرو سے مشورہ لینے کے لیے اسے لکھا۔ شیخ صاحب بضد تھے کہ یُوراج فوراً اپنا فیصلہ بتاتے۔ وہ ذرا سی بھی تاخیر برداشت نہ کر سکتے تھے۔ پنڈت نہرو نے کشمیر اور اس حوالے سے سارے ملک کے حالات کے مدِ نظر یُوراج کو بھی یہی راتے دی کہ وہ شیخ صاحب کی تجویز مان لے۔ چنانچہ مہاراجہ کی اور اہم ڈوگرہ شخصیتوں کی زبردست مخالفت کے باوجود، اس نے صدر ریاست کا عہدہ سنبھالنے کی رضامندی دے دی۔

جہلم کے کنارے بنے پُرانے محل، راج گڑھ محل کے دربار ہال کو آئین ساز اسمبلی کے لیجسلیٹو چیمبر میں تبدیل کر دیا گیا تھا اور اسی ہال میں چیف جسٹس وزیر جانکی ناتھ نے یُوراج کو حلف دلوایا تھا۔ اس موقع پر یُوراج کرن سنگھ نے ایک بہت ہی اچھی تقریر کی تھی جو مختلف اخباروں میں چھپی تھی۔ تقریر کے آخری حصے کی بہت تعریف ہوتی تھی۔ میں نے اس تقریر کا ایک تراشا اپنے پاس محفوظ کر لیا تھا۔

Our state can be in a position to face all
these vital issues only with the united

strength of our people. In this land of colour and beauty, men of different faiths and creeds live as the common inheritors of a great past and culture. It is our task now to forge a greater unity among them as the joint architects of their future. Such abiding unity cannot be imposed from above but has to be based upon the interests of the common man in all parts of the State. In building this equal partnarship of all the people and all the regions of this State, a solemn duty devolves upon each one of us to do our bit, to make our individual contribution. With your blessings and good wishes I hope to be able to effectively contribute towards this end.

آئین ساز اسمبلی کے اس اجلاس کے بعد ڈوگرہ راج کا آخری نمائندہ عوامی حکومت کا سربراہ بن کر بادشاہت کے سبھی اختیارات اور حقوق سے محروم ہو گیا۔

میں نے پے در پے دہلی کے کئی چکر لگائے اور اپنے جرنلسٹ دوستوں سے تعلقات اُستوار کیے۔ مجھے اس بات کا اندازہ نہیں تھا کہ میری صحافتی تحریروں کو میرے دوست پسند کرتے تھے اور ان کا بھی یہی خیال تھا کہ مجھے سیاست میں کم اور صحافت میں زیادہ دلچسپی لینی چاہیئے۔ میرے ایک دوست نے تو بڑی مزیدار بات کہی۔ اس نے کہا کشمیر میں شیخ عبداللہ کی حیثیت اب برگد کے اُس پیڑ کی سی بن گئی تھی، جس کے سایے میں کوئی بھی نیا اور نازک پودا پروان نہ چڑھ سکتا تھا۔ وہی پودے قدآور ہو سکتے تھے جو اپنی جڑیں دھرتی میں مضبوطی سے گاڑ چکے تھے اور جنہیں اب اپنی حفاظت کی ضرورت نہیں رہی تھی۔ اس گھنے پیڑ کی چھاؤں میں جہاں دھوپ کی کرنیں بھی نہیں پہنچ سکتیں، نئے پودوں کا پنپنا آسان نہیں تھا۔ مجھے یہ جان کر حیرت ہوئی کہ ریاست

سے سینکڑوں میل دُور رہنے والے لوگوں نے بھی شیخ عبداللہ کی شخصیت کا بخوبی تجزیہ کر لیا تھا۔ دہلی کے انہی چکروں کے دوران اپنے جرنلسٹ دوستوں کے ساتھ، مجھے کچھ قومی رہنماؤں سے بھی ملنے کا اتفاق ہوا۔ جو لوگ کچھ برس پہلے شیخ عبداللہ کے بہت بڑے مدّاح تھے، اب ان کے دلوں میں بھی دراڑیں آنے لگی تھیں۔ شیخ صاحب "دہلی ایگریمینٹ" کو پوری طرح لاگو نہ کرنے اور کشمیر کے سٹیٹس کے بارے میں نت نئے سوال اٹھانے سے، ان کے اپنے مدّاحوں کے دلوں میں بھی خدشے پیدا ہونے لگے تھے۔ دہلی کے انہی دَوروں کے دَوران میں نے کچھ لیڈنگ پیپرز میں اپنے خیالات کا کھُل کر اظہار کیا۔ اس سے مجھے کچھ آمدنی بھی ہوئی اور میرا سرکل بھی بڑھا اور میری تحریروں کی تعریف بھی ہوئی۔ میں نے خود بھی محسوس کیا کہ اگر میں جموں کشمیر کی سیاست کے اندھیرے کنوئیں میں پڑا رہوں گا تو کھُلی فضاؤں کے دریچے میرے لیے بند ہو جائیں گے۔

جب میں جموں واپس آیا تو میری ان تحریروں کا متضاد ردِّعمل تھا۔ کچھ لوگ جو غیر جانبداری سے سوچتے تھے، انھیں میرا یوں کھُل کر بات کرنا اچھا لگا تھا۔ لیکن وہ لوگ جن کا زیادہ تعلق وادی سے تھا اور جو شیخ صاحب کے قریب تھے، میرے خلاف ہو گئے تھے۔ اس کا واضح ثبوت یہ تھا کہ بشیر احمد نے اپنے ایک خط میں اپنی اور اپنے کچھ ساتھیوں کی ناراضی کا اظہار کیا تھا اور لکھا تھا کہ شیخ صاحب میری ان تحریروں سے ناخوش تھے اور چاہتے تھے کہ میں ان سے فوراً ملوں۔ لیکن میں انہیں ملنے نہیں گیا۔ اس سے حالات اور بھی خراب ہو سکتے تھے! دُران کی غلط فہمی اور بھی بڑھ سکتی تھی۔ شیل کی بھی یہی رائے تھی کہ میں شیخ صاحب سے فوری طور سے نہ ملوں۔

بخشی غلام محمد تھوڑے عرصے کے بعد جموں آتا رہتا تھا۔ اس بار جب وہ جموں آیا تو اس نے مجھے بُلوا بھیجا۔ اس دوران میرا ایک اور مضمون دہلی کے ایک لیڈنگ پیپر میں چھپ چکا تھا، جس میں مَیں نے اس بات کا تقاضا کیا تھا کہ شیخ صاحب "دہلی ایگریمینٹ" کے بارے میں وضاحت کریں، جس سے کشمیر کے مسئلے کو حل کرنے میں مدد مل سکے۔ بخشی غلام محمد کی نظر سے میرا یہ مضمون گزر چکا تھا۔ اُس سے ملا تو گفتگو کے دوران میں نے یہ مسئلہ پھر اُٹھایا۔ بخشی کی باتوں سے مجھے لگا کہ کابینہ کے ممبروں میں بھی آپسی اختلافات بڑھتے جا رہے تھے جس کا ردِّعمل یہ ہوا تھا کہ شیخ عبداللہ کے برتاؤ میں پہلے سے زیادہ سختی آگئی تھی، جیسے کچھ ساتھیوں نے تکبر کا نام دینا شروع کر دیا تھا۔ بخشی کی پبلک ریلیشنگ زیادہ تھی اس لیے ایک عام آدمی آسانی سے اُسے مل سکتا تھا اور اپنی بات کہہ سکتا تھا۔ اس سے بخشی کو یہ فائدہ ہو رہا تھا کہ اُسے بہت سے لوگوں کے مختلف قسم کے خیالات سننے کو مل جاتے

تھے۔یعنی اس کو اطلاعات حاصل کرنے کے زیادہ ذرائع مل رہے تھے،جن کا وہ زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتا تھا۔بخشی سے اس ملاقات کے بعد میں نے دہلی کے اخبارات میں فری لانسنگ زیادہ کردی۔میری تحریروں میں زیادہ کھلا پن آگیا اور ایک جرنلسٹ کی حیثیت سے میری آئی ڈینٹٹی بننے لگی۔بخشی سے میری ملاقاتوں کا سلسلہ زیادہ بڑھ گیا۔

ایک دن گندوترا اور سُبھاشنی مہاجن ملنے آئے۔وہ دونوں مجھ سے تفصیل سے بات کرنا چاہتے تھے۔

"بہت دنوں میں آئی ہو سُبھاشنی؟"شیل نے پوچھا۔

"سوچا سرفراز صاحب کو دیکھ آؤں۔"

"اچھا کیا۔اب تو یہ حضرت واقعی صاحب بنتے جارہے ہیں۔"

"آنٹی کو آداب کہو،سرفراز۔"میں نے سرفراز کو اپنی بانہوں میں لیتے ہوئے کہا اور سرفراز نے بڑے سلیقے سے اپنا چھوٹا سا دایاں ہاتھ ماتھے تک لے جاتے ہوئے،سُبھاشنی کو آداب عرض کیا۔"اور اب گندوترا انکل کو بھی۔"میرے کہنے سے اس نے گندوترا کو بھی آداب کیا۔

گندوترا اور سُبھاشنی نے ہنستے ہوئے تالیاں بجائیں اور سرفراز اپنے ہونٹوں پر بڑی شرارت آمیز مسکراہٹ کھینڈاتا ہوا شیل کے پاس چلا گیا۔

"اس کی مسکراہٹ میں بڑی شرارت ہے۔بھابھی۔"

"اپنے باپ پر جو گیا ہے،گندوترا۔"شیل نے جواب دیا۔

"میرا خیال ہے ماں پر گیا ہے۔"میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

"چلو سرفراز سے ہی پوچھتے ہیں۔کیوں بھئی تمہاری مسکراہٹ کس پر ہے؟"

سرفراز سُبھاشنی کے اس سوال پر ذرا سا مسکرایا اور اپنے دائیں ہاتھ کی ایک انگلی شیل کے ہونٹوں پر رکھ دی۔

"کیوں بھئی ہوگیا معاملہ صاف؟"میں نے پوچھا۔

"بالکل صاف ہوگیا۔"گندوترا بولا۔

"میں چائے لیکر آتی ہوں،آپ باتیں کریں۔"شیل جب کچن کی طرف بڑھی تو سرفراز اس کے پیچھے پیچھے ہولیا۔

"یہ تو اپنی ماں کا چمچہ ہے۔"میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

"گند وترا، تم بھی تو بہت دنوں میں آتے ہو۔"

"تم تو آجکل دلی کے چکر لگاتے رہتے ہو اور اخباروں میں دھڑا دھڑ لکھتے رہتے ہو۔"

"پڑھتے بھی ہو کبھی ؟"

"کیوں نہیں پڑھتا۔ لگتا ہے تم اب سیاست چھوڑ رہے ہو ؟"

"چھوڑ تو نہیں رہا البتہ میرے مَن میں طرح طرح کے سوال اُٹھنے لگے ہیں۔"

"پہلے نہیں اُٹھتے تھے ؟"

"نہیں۔ شاید اس لیے کہ ریاست کے باہر کے لوگوں سے رابطہ نہیں تھا۔ گند وترا، لوگ بڑے جاگے ہوتے ہیں۔ ہم تو نیند میں ہیں ابھی۔"

"آپ کی یہ بات تو بہت حد تک ٹھیک ہے۔" سُبھاشنی نے میری تائید کی۔

"نیشنل کانفرنس کے کچھ چانسز ہیں جموّں میں ؟"

"بہت کم۔ شیخ صاحب کی جموّں میں کوئی دلچسپی نہیں۔ اسے وہ پرجا پریشد کا ہی گڑھ سمجھتے ہیں۔"

"تو ہم لوگ اب کیا کریں ؟"

"میں خود بڑا کنفیوزڈ ہوں۔ میرے آرٹیکل پڑھ کر شیخ صاحب کے قریبی لوگ مجھ سے ناراض ہو گئے ہیں۔"

"آپ کو کیسے معلوم ہے ؟" سُبھاشنی نے پوچھا۔

"بشیر احمد کا خط آیا تھا کچھ روز پہلے۔ اس میں اس نے کچھ لوگوں کے ناراض ہونے کی بات لکھی تھی۔ یہ بھی لکھا تھا کہ شیخ صاحب مجھ سے ملنا چاہتے ہیں۔"

"تو آپ ان سے ملنے نہیں گئے ؟"

"جاتا تو آپ لوگوں سے مشورہ کر کے ہی جاتا۔ بس اس لیے نہیں گیا کہ اگر انھوں نے کوئی اُلٹی سیدھی بات کہہ دی تو اختلافات بڑھ جائیں گے۔"

"میری بھی یہی رائے تھی۔" شیل میز پر چائے رکھ رہی تھی اور سرفراز اس کے دوپٹے کا چھور پکڑے پاس کھڑا تھا، جیسے اپنی ماں کی نگہبانی کر رہا ہو۔

"دراصل آج کل شیخ صاحب زیادہ سخت ہوتے جا رہے ہیں۔ اب وہ سمجھوتے کرنے کے موڈ میں نہیں ہیں۔" شیل نے اپنی بات کی اور وضاحت کرتے ہوئے کہا۔

"مجھے بتلائیے میں کیا کروں اب؟" سُبھاشنی نے پوچھا۔
"شادی اور کیا؟" میں مُسکرایا۔
"مذاق نہ کیجئے۔ آج کل مہاجن صاحب سے میرا بھی جھگڑا رہتا ہے۔"
"اب وہ ایڈووکیٹ جنرل بھی تو بن گئے ہیں۔" گندوترا نے ٹوکا۔
"پھر تو جھگڑا ہونا ہی چاہیئے۔" شیل نے بھی حامی بھر دی۔
"وہ چاہتے ہیں یا تو میں شادی کر لوں یا لا میں داخلہ لے لوں۔ پالیٹکس پسند نہیں ہے انھیں۔"
"میرے فادر سے بھی تو میرا یہی جھگڑا رہتا تھا۔ میں نے فارغ خطی لے لی۔"
"میں ایسا نہیں کر سکتی۔"
"اگر تو شادی کرنا چاہتی ہو تو بس سارے جھگڑے ختم۔"
"اور جو مرضی ہے کر لو۔ لیکن شادی نہ کرنا۔" شیل نے اس کی پیٹھ ٹھونکی۔
"مہاجن صاحب تو اسی پر زور دے رہے ہیں۔"
"تو کوئی لڑکا ہوگا اُن کی نظر میں۔" شیل نے کہا۔
"اگر شادی کرنی ہے تو کسی میرے جیسے آدمی سے کرنا۔" میں نے مسکراتے ہوتے کہا۔
"تاکہ بھوکوں مرو۔" شیل زور سے ہنسی۔
"مذاق چھوڑیے۔ میں تو آپ کی ایڈوائس لینے آئی ہوں۔"
"لا میں داخلہ لے لو۔"
"دہلی میں؟"
"ہاں۔ شاید ہم لوگ بھی دہلی شفٹ کر جائیں۔"
"یہ کیا کہہ رہے ہو تم؟" گندوترا غصے سے بولا۔
"اور کیا کروں؟ لگتا ہے یہاں تو ہم لوگ کچھ نہیں کر سکیں گے"
"تو میں کہاں جاؤں؟"
"تم بھی دہلی شفٹ کر جاؤ۔ وہیں اپنے بزنس کی ایک برانچ کھول لو۔"
"تو ماں باپ کو چھوڑ جاؤں؟"
"تم نہیں چھوڑو گے تو وہ تمہیں گھر سے نکال دیں گے۔ بہر حال رُک جاؤ کچھ دن اور۔

مجھے ذرا حالات کا جائزہ لے لینے دو۔ اس بار میں بخشی غلام محمد سے بات کروں گا۔"
گندوترا اور سبھاشنی چلے گئے۔ مجھے محسوس ہوا کہ ہمارے ان ساتھیوں میں، جواب تک بڑے خلوص سے ہمارا ساتھ دیتے چلے آرہے تھے، فرسٹریشن بڑھتی جارہی تھی۔ آخر کوئی کب تک بے مقصد اور غیر واضح کام سے جڑا رہ سکتا ہے۔ کوئی تو منزل ہونی چاہیئے سامنے، جس کے حصول کے لیے تم جدوجہد کرو۔ دیواروں سے سر پھوڑنے سے تو کچھ بھی حاصل نہیں ہوگا۔ نوجوانوں کا ایک پورا گروپ میرے ساتھ تھا۔ مجھے ان کی ٹھیک طرح سے رہنمائی کرنی چاہیئے۔ ورنہ وہ بھٹک جائیں گے اور غلط سلط سمجھوتے کرنے لگیں گے۔

اس رات میں بہت پریشان رہا۔ لگا جیسے میں ایکدم خود غرض ہو گیا تھا۔ صرف اپنے ہی مستقبل کی فکر کرنے لگا تھا۔ اور یہ بات بھول گیا تھا کہ میرے کچھ ساتھی بھی میرے ساتھ تھے جن کو یوں راستے میں چھوڑ دینا اخلاقی طور پر ایک بہت بڑا جرم تھا۔ بہت دیر تک شیل سے بات ہوتی رہی۔ وہ مجھ سے متفق تھی لیکن اس کا خیال تھا کہ ابھی تو مجھے مستقل طور پر ریاست کو نہیں چھوڑنا چاہیئے اور اگر حالات ایسی شکل اختیار کرلیں کہ میرا دہلی جانا ضروری ہو جائے تو اس حالت میں مجھے اکیلے ہی جانا چاہیئے۔ اُسے جموں ہی میں رہنا چاہیئے۔ دونوں گھروں کا کوئی آدمی تو یہاں رہے ورنہ دونوں کے ماں باپ یہ سوچیں گے کہ ہم نے انہیں ہمیشہ کے لیے چھوڑ دیا ہے۔

"تو اس میں تمہیں شک ہے؟"

"ہاں۔ اپنے لیے ایک ساتھ سبھی دروازے بند نہیں کر دینے چاہئیں۔"

"میں تو کر چکا ہوں۔"

"یہ تمہارا اپنا خیال ہے۔"

"اور تمہارا کیا خیال ہے؟"

"یہ کہ ابھی تمام دروازے بند نہیں ہوتے۔"

"کون سا دروازہ کھُلا رہ گیا ہے اب؟"

"تمہاری مہربان ماں کا، جسے جب بھی وقت ملتا ہے، تمہیں آشیرواد دینے آجاتی ہے۔"

"تو میری ماں کو پٹا رکھا ہے تم نے؟"

"یہی سمجھ لو۔"

ہماری گفتگو تو ختم ہو گئی لیکن ایک بات ضرور صاف ہو گئی کہ ہمیں اپنے ساتھیوں کو

کو اپنے ساتھ رکھنا ہو گا۔ انھیں مناسب مشورہ دینا ہو گا اور اُن کے مسائل کو حل کرنا ہو گا۔

شیخ عبداللہ کے بخشی غلام محمد اور کچھ دوسرے وزیروں کے ساتھ اختلافات بڑھتے جا رہے تھے۔ شیخ صاحب اب اپنی تقریروں میں خود مختار کشمیر کی بات کرنے لگے تھے۔ جس کا واضح مطلب یہ تھا کہ وہ کشمیر سے ہندوستان کے الحاق کو خود ہی جھٹلانے لگے تھے۔ حالانکہ یہ الحاق انہی کی وجہ سے عمل میں آیا تھا۔ اس طرح نیشنل کانفرنس کا مستقبل ایکدم مخدوش ہو گیا تھا۔ جموں کے لوگوں کا شیخ عبداللہ پر سے وشواس اُٹھنے لگا تھا۔

پھر مجھے اچانک دہلی جانا پڑا۔ یہ بات اخباروں میں بھی زیر بحث آگئی تھی، کہ شیخ صاحب اب خود مختار کشمیر کے خواب دیکھنے لگے تھے۔ رائے عامہ بدلنے لگی تھی۔ وہ جو کبھی شیخ صاحب کو کشمیر کا مسیحا سمجھنے کی بات تھی، اس نے دوسری شکل اختیار کر لی تھی اب۔ ان دنوں یُوراج کرن سنگھ بھی دہلی میں تھا۔ وہ شاید پنڈت نہرو سے ملنے اور اس سے مشورہ کرنے گیا تھا۔ وادی کے سیاسی حالات تیزی سے بگڑنے لگے تھے۔ میں نے کچھ اخباروں کو انٹرویو بھی دیے تھے اور شیخ صاحب کے اس رویے کی نکتہ چینی بھی کی تھی۔ جانے کیوں مجھے یہ احساس ہونے لگا تھا کہ شیخ صاحب مجھ سے ناراض تھے۔ کیونکہ میں ان سے کئی مہینوں سے نہیں ملا تھا اور اب دہلی کے اخباروں میں کشمیر کے سیاسی حالات کے بارے میں لگاتار لکھ رہا تھا۔ مجھے لگا کہ میری واپسی پر مجھے ضرور گرفتار کر لیا جائے گا۔

جب میں جموں واپس آیا تو گندوترا نے بتایا کہ پولیس میرے خلاف ایکشن لینے والی تھی، اس لیے مجھے فوراً دہلی لوٹ جانا چاہیے۔ رشیل کی بھی یہی رائے تھی، کیونکہ میرے فادر نے میری ماں کے ذریعہ رشیل کو اس قسم کا پیغام بھجوایا تھا۔

اگلے دن تو کشمیر کی سیاست نے ایک ایسا موڑ لے لیا جس کی کسی کو توقع ہی نہ تھی۔

شیخ عبداللہ کو راتوں رات 'صدر ریاست نے' وزیر اعظم کے عہدے سے برطرف کر دیا تھا اور پولیس نے انھیں اور ان کی بیگم کو گلمرگ کے ریسٹ ہاؤس سے گرفتار کر کے اُودھم پور کے تارا نواس محل میں نظر بند کر دیا تھا۔ دہلی کے اخباروں میں ایک دن بعد یہ خبر بڑی بڑی موٹی سُرخیوں کے ساتھ چھپی تھی اور اس حکم کو بھی شائع کیا گیا تھا جس کی رُو سے شیخ عبداللہ کو وزیر اعظم کے عہدے سے برطرف کیا گیا تھا۔

اس سے ایک دن بعد بخشی غلام محمد نے وزیر اعظم کا عہدہ سنبھال لیا تھا۔ جموں کشمیر کی سیاست میں یہ دھماکہ بڑا معنی خیز تھا۔ خاص طور سے اس لحاظ سے کہ دہلی ایگری مینٹ کو عملی جامہ پہنانے

کے لیے اب کوئی اڑچن نہیں رہی تھی۔ خود مختار کشمیر کا وہ نعرہ جسے شیخ عبداللہ نے بارہا اپنی تقریروں میں بلند آوازیں اُبھارا تھا اب خود بخود دب گیا تھا۔

میری گرفتاری کا جو منصوبہ بنا تھا آپ سے آپ ہی ختم ہو گیا۔

کچھ روز بعد بخشی غلام محمد جموں آیا۔ یہاں کے لوگوں نے اس کے وزیراعظم بننے پر خوشی کا اظہار کیا اور کئی جگہ استقبالیے دیے گئے۔ دہلی کے بیشتر اخباروں کے لیے میں نے ہی خبریں بھیجی تھیں جو بخشی کی تصویروں کے ساتھ شائع ہوئیں۔

سرینگر جانے سے پہلے اس نے مجھے صبح چائے پر بلایا۔ بہت دیر گفتگو ہوئی۔ اس کا یہ خیال تھا کہ میں اپنی جرنلسٹ ایکٹیویٹیز کے لیے جموں کے بجائے دہلی کو مرکز بناؤں۔ بلکہ اُس نے ایک اُردو رسالہ بھی جاری کرنے کی بات چلائی۔ رسالہ حکومت کا ہوگا جسے میں دہلی میں ایڈٹ کروں گا اور اس کی تقسیم جموں اور کشمیر میں کی جائے گی۔ میں نے اپنی رضامندی کا اظہار کیا اور کہا کہ میں اس بارے میں اپنے ساتھیوں سے بات کروں گا۔

اس دن پہلی بار میں شیل کے ساتھ اپنے گھر گیا کیونکہ میرے فادر کو ہارٹ اٹیک ہو گیا تھا اور وہ ڈاکٹر برکت رام کے پرائیویٹ اسپتال میں داخل تھے۔ اس لیے کہ انھیں اس ڈاکٹر پر بہت وشواش تھا اور اس نے کوئی دو سال پہلے سرکاری ملازمت چھوڑ کر موتی بازار کی نکڑ پر پریڈ گراونڈ کے عین سامنے اپنا دو منزلہ اسپتال بنوایا تھا اور سبھی کھاتے پیتے لوگ علاج کے لیے اسی اسپتال میں آتے تھے۔ جب شیل اور میں اسپتال پہنچے، ڈاکٹر نے انھیں پراویٹ کمرے میں شفٹ کر دیا تھا۔ ماں بیڈ کے سامنے کرسی پر بیٹھی تھی اور بے حد پریشان لگ رہی تھی۔ ہم دونوں کو دیکھ کر وہ بہت خوش ہوئی۔ اور جب ہم دونوں نے اس کے پاؤں چھوئے تو اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ یہ خوشی کے آنسو تھے۔ جب میں نے اپنے فادر کے پاؤں چھُونے کو ہاتھ بڑھایا تو انھوں نے میرا ہاتھ اپنے کمزور ہاتھ میں تھام کر اپنے ماتھے سے لگا لیا۔ ان کا ماتھا بیحد سرد تھا۔

جانے کیوں میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ مجھے محسوس ہوا کہ ان کے ہارٹ اٹیک کا اصلی ذمہ دار میں تھا۔ میری ہی وجہ سے ان کے دماغ پر اتنا تناؤ رہتا تھا اور میرے ہی کارن وہ اتنے پریشان رہتے تھے۔

شیل تو گھر چلی گئی لیکن میں اس رات اسپتال ہی میں رہا۔ ایک دفعہ ڈاکٹر برکت رام سے ملا تو اس نے فادر کی حالت تسلّی بخش بتائی اور کہا کہ اب انھیں دو تین ماہ تک مکمل آرام کرنے

کی ضرورت تھی ۔ہیں اور ماں دیر تک جاگتے رہے اور آپس میں کھسر پُسر کرتے رہے ۔البتہ فادر گہری نیند سو رہے تھے ۔

چار دن کے بعد ہم فادر کو گھر لے گئے اور ان کی دیکھ بھال کا پورا انتظام کر دیا ۔انھوں نے تین ماہ کی چھٹی لے لی تھی ۔اس دن شیل نے مجھ سے کھل کر بات کی ۔

" مجھے تو ماں جی کی حالت بھی اچھی نہیں لگ رہی ۔"

"میرا بھی یہی خیال ہے ۔"

"ان کا بھی میڈیکل چیک اپ کرانا چاہیئے ۔"

" ڈاکٹر برکت رام سے بات کرتا ہوں ۔"

"پتا جی کی تو بہت کیئر کرنی پڑے گی ۔"

" ڈاکٹر برکت رام سے کہہ کر کسی نرس کا انتظام کرا دیتے ہیں ۔"

" یہ کافی نہیں ہو گا ۔"

" تو اور کیا کرنا چاہیئے ۔"

" مجھے ان کے پاس رہنا چاہیئے ۔اس وقت انھیں ہماری ضرورت ہے ۔"

" تو تم گھر چلی جاؤ ۔"

" تم اکیلے رہو گے کراتے کے مکان میں ؟"

"اس میں کیا برائی ہے ؟"

" برائی تو کوئی نہیں لیکن اریجینٹ تسلی بخش نہیں ہو گا ۔"

"تو کیا کریں ہم لوگ ؟"

"تم بھی وہیں چلو ۔آخر اپنے گھر ہی تو جاؤ گے ۔"

"لیکن میں تو وہ گھر کب کا چھوڑ چکا ہوں ۔"

"گھر نے تو تمھیں نہیں چھوڑا ۔تمہارے ماں باپ کو تمہاری ضرورت ہے اس وقت تمھیں یاد نہیں جب پتا جی نے تمہارا ہاتھ اپنے ہاتھ میں تھام کر اپنے ماتھے سے لگایا تھا تو وہ کتنے جذباتی ہو گئے تھے ۔"

" یاد ہے ۔ مجھے بھی بہت اچھا لگا تھا ۔ جیسے ایک ہی لمحے میں سارے اختلافات ختم ہو گئے تھے ۔"

"یہی سمجھو کہ اب تمہارا کوئی اختلاف نہیں رہا ہے اپنے ماں باپ سے۔"

"تو پھر؟"

"ہم دونوں سرفراز کو ساتھ لے کر وہیں چلے جاتے ہیں، اپنے گھر جہاں تمہاری مہربان ماں کی دعائیں ہماری حفاظت کریں گی۔"

میرے پاس شیل کے دلائل کا کوئی جواب نہیں تھا۔ شیل کتنا مثبت رول ادا کر رہی تھی۔ میں نے اُسے ٹوکا نہیں۔ اُس کی بات بنا مزید بحث کے مان لی۔ اُسی شام ہم ریذیڈینسی روڈ کا کرایے پر لیا مکان چھوڑ کر اپنے گھر چلے گئے۔ مالک مکان، اس کی بیوی اور ان کے بیٹے رام رتن کو کوئی اعتراض نہیں تھا۔ بلکہ وہ بہت خوش تھے۔

اُس رات جب میرے فادر نے سرفراز کو اپنی گود میں لے کر اسے پیار کیا، تو مجھے لگا کہ ایک مرجھاتے ہوئے گلشن میں پھر سے بہار آگئی تھی۔ ہزاروں پھول ایک ساتھ کھل گئے تھے اور پورے چاند کی مہربان چاندنی نے انسانی رشتوں کے عمارت کو ایکدم اُجالوں سے نہلا دیا تھا۔ انسانی رشتوں کو اپنی بقا کی ایک اور گواہی مل گئی تھی۔ اب ہم سب کو اپنی شفیق اور مہربان ماں کی دعائیں حاصل ہو گئی تھیں، جو ہمارے مستقبل کی ضامن تھیں۔

اس رات مجھے یوں لگا جیسے ایک بے وطن اور بے گھر آدمی، برسوں دشت و صحرا کی خاک چھان کر اپنے گھر لوٹ آیا تھا۔ اس رات مجھے شیل پہلے سے کہیں زیادہ خوبصورت اور وفادار لگی اور سرفراز کی مسکراہٹ نے مجھے ایک ایسا پیغام دیا، جسے بھلاتے ہوئے زمانے ہو گئے تھے۔ میں اور شیل ایکدوسرے کے ہاتھ میں اپنا ہاتھ دیئے دیر تک خاموش لیٹے رہے اور کھڑکی سے نظر آتے پورے چاند کو نہارتے رہے۔ سرفراز میرے سینے پر پڑے پڑے ہی سو گیا تھا۔

اپنے گھر کی چار دیواری ہمیں اپنے تحفظ کا کتنا زیادہ احساس دلاتی ہے، اس کا اندازہ اتنے برس اس سے محروم رہنے کے بعد ہوا تھا۔ اب مجھے لگتا تھا کہ شیل اور سرفراز کتنے محفوظ تھے۔ پہلے میں جب بھی باہر جاتا تھا، تو مکان کی مالکن اور اس کے بیٹے رام رتن کو یہ کہہ کر جاتا تھا کہ وہ میری غیر حاضری میں ان کا خیال رکھیں۔ اب کسی کو کچھ کہنے کی ضرورت نہ پڑتی تھی۔ گھر کی چار دیواری بنا میرے کہے کے ہی

ساری ذمہ داری اپنے سر لے لیتی تھی اور جب میں واپس آتا تھا تو گھر کی دیواریں سرگوشی کے انداز میں کہتی تھیں کہ انھوں نے اپنی ذمہ داری کو بڑی خوش اسلوبی سے نبھایا تھا۔ جس کی گواہی مجھے شیل اور سرفراز سے مل جاتی تھی۔ اب تو سرفراز نے ماڈل اکاڈمی میں داخلہ بھی لے لیا تھا۔ یہ تعلیمی ادارہ اُن دنوں خاصا پاپولر تھا اور ہمارے گھر سے بہت دُور بھی نہیں تھا۔ دادا اور پوتے کی آپس میں گہری دوستی ہوگئی تھی۔ سرفراز ہر رات اپنے دادا کے پاس بیٹھ کر کہانیاں سُنتا تھا اور بے حد خوش ہوتا تھا۔ میرے فادر کے پاس کہانیوں کا بہت بڑا ذخیرہ تھا۔ خود میں بھی تو بچپن میں ان سے کہانیاں سُنا کرتا تھا۔ ایک نسل کا ورثہ دوسری نسل کو اسی طرح تو منتقل ہوتا ہے۔ دُنیا کا لوک ورثہ اسی طرح تو محفوظ رہا ہے اور نسل در نسل سفر کرتا رہا ہے۔

سُبھاشنی مہاجن کو دہلی یونیورسٹی کے لاڈیپارٹمنٹ میں داخلہ لیے لگ بھگ ایک برس ہوگیا تھا۔ اس دوران وہ تین بار جموں آچکی تھی۔ اُسے دہلی کی زندگی اچھی نہیں لگی تھی۔ کہاں جموں کے سادہ اور مروت والے لوگ اور کہاں دہلی میں جگہ جگہ سے اکٹھا کیا ہوا اینٹ روڑا۔ کوئی کسی کی پروا نہ کرتا تھا۔ لڑکی ایک سے ایک انا کی ماری ہوتی تھی۔ سُبھاشنی بے چاری تو بہت دنوں تک اُکھڑی اُکھڑی رہی۔ اب جا کے اسے جموں کی دو ایک فیمیلیز ملی تھیں، جن کے ہاں وہ کبھی کبھی چلی جاتی تھی۔ لیکن فاصلے اتنے زیادہ تھے کہ کہیں جانے کے لیے بڑی ہمت کرنی پڑتی تھی۔ بہرحال اب تو تین چار برس اُسے وہاں رہنا ہی تھا۔ گندوترا نے اپنا آڑھت کا کاروبار اُودھم پور منتقل کر لیا تھا اور رکھدروا، اور کشتواڑ تک چکر لگاتا رہتا تھا۔ ہفتے دس دن میں ایک آدھ بار جموں آتا تو ہمیں ضرور ملتا تھا۔ اب اُس کے گھر والے اصرار کر رہے تھے کہ وہ شادی کر لے لیکن وہ اس کے لیے تیار نہ تھا۔ ایک بار شیل نے اُسے کہا۔

"تم شادی کیوں نہیں کرتے۔ گھر والوں کی بات مان لینی چاہیئے۔"

"شادی تو کر لوں لیکن ہنی مون کے لیے چندہ کون اکٹھا کرے گا؟"

"وہ میں کر دوں گی۔ تم شادی تو کرو۔"

"ارے اس کی باتوں میں مت آجانا۔ برباد ہو جاؤ گے۔"

"تم کتنے برباد ہوتے ہو؟"

"اپنی ہمت سے بچتا رہا ہوں۔ ورنہ تم نے تو کوئی کسر نہیں چھوڑی۔"

گندوترا آتا تھا تو اس سے گفتگو ہو جاتی تھی۔ ورنہ تو میں اب ایک طرح سے جرنلزم سے

ہی وابستہ ہوگیا تھا اور دہلی کے چکر زیادہ لگنے تھے۔ بخشی غلام محمد کی تجویز پر ایک ماہنامہ جاری ہوگیا تھا جسے میں دہلی سے ایڈیٹ کرتا تھا لیکن اس پر میرا نام نہیں ہوتا تھا۔ کہنے کو تو وہ ادبی پرچہ تھا اور اس میں جانے پہچانے ادیب اور شاعر لکھتے تھے لیکن دراصل تو وہ کشمیر کی سیاست کا ترجمان تھا۔ اس طرح سے بخشی غلام محمد سے میری خاصی ملاقاتیں ہو جاتی تھیں اور جب کبھی موقع ملتا تھا تو میں عوام کی بہتری کے لیے کوئی نہ کوئی تجویز بھی پیش کر دیتا تھا۔

ہماری پارٹی کے ورکرز اب بکھر گئے تھے۔ اگر ہم لوگ نیشنل کانفرنس کو جموں میں مضبوط کر سکتے تو سارے کا سارا گروپ ایک مرکز پر جمع رہتا۔ ایسا نہیں ہو سکا تھا۔ اس لیے سارے ساتھی زندگی کی تگ و دو میں مصروف ہو گئے تھے۔ پھر بھی کبھی کبھی گندو ترا سب کو اکٹھا کرنے کی کوئی نہ کوئی سبیل نکال ہی لیتا تھا۔ جب کبھی سُبھاشنی دہلی سے دو ایک دن کے لیے جموں آتی تھی اُس وقت تو ہم لوگ اکٹھے ہو ہی جاتے تھے۔ سُبھاشنی نے دہلی کے پیٹرن پر یہاں بھی ایک کلچرل ایسوسی ایشن بنائی تھی جس کی سکریٹری شیل تھی۔ اس طرح ہم لوگ کوئی نہ کوئی فنکشن کر لیتے تھے اور کسی ایک دوست کو دہلی سے بھی لے آتے تھے۔ مطلب یہ کہ ہمارا گروپ عملی طور پر زندہ تھا اور ہماری یہ کوشش رہتی تھی کہ ہم اپنی روایات کو بھی زندہ رکھیں۔ لیکن افسوس کی بات یہ تھی کہ کچھ ایسے عناصر ابھرنے لگے تھے جن کا سیدھا رابطہ سیاست سے تھا اور جو ریاست میں امن و آشتی کی پرمپراؤں کو نقصان پہنچانا چاہتے تھے۔ ان کا اپنا فائدہ اسی صورت میں ہو سکتا تھا کہ مجموعی طور پر عوام کی زندگی کو نقصان پہنچے۔

میرے والد نے چھٹی اور بڑھوالی تھی۔ میں نے تو انہیں یہ مشورہ بھی دیا تھا کہ وہ ریٹائرمنٹ لے لیں۔ لیکن میری بات انھوں نے نہیں مانی۔ ان کے معمول میں بڑا ڈسپلن تھا۔ صبح شام سیر کرتے۔ دوپہر کو آرام کرتے اور جتنا وقت ملتا تھا اسے مطالعہ میں صرف کرتے تھے۔ اس کے باوجود ان کی صحت میں زیادہ فرق نہیں پڑا تھا۔ بڑی باقاعدگی سے وہ ڈاکٹر برکت رام سے اپنا چیک اپ بھی کرواتے رہتے تھے۔ لیکن نتائج کوئی حوصلہ افزا نہیں تھے۔

جب انھیں دوسرا ہارٹ اٹیک ہوا، میں دہلی میں تھا۔ شیل نے انھیں فوراً ہی اسپتال پہنچا دیا تھا اور ڈاکٹر نے وقت سے سنبھال بھی لیا تھا۔ شیل نے مجھے دہلی ٹیلی فون کیا تھا اور کہا تھا کہ میں فوراً واپس آؤں۔ والد نے رات بڑی بے آرامی سے کاٹی تھی ہارٹ قابو میں آ ہی نہیں رہا تھا۔ میں جموں پہنچتے ہی سیدھا اسپتال گیا۔ مجھے لگا جیسے وہ میرا ہی انتظار کر رہے تھے۔ مجھے

دیکھتے ہی انھوں نے اشارے سے اپنے قریب آنے کو کہا اور جب میں نے ان کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر ان کے ماتھے کو چھوا تو اسی لمحہ ان کی آنکھیں بند ہو گئیں۔ جتنی دیر میں ڈاکٹر پہنچا وہ ہم سے منہ موڑ چکے تھے۔ میں پھپھک پڑا۔ ماں چیخ اٹھی اور شیل نے اسے سنبھال لیا۔

اگلے روز جب میرے والد کی ارتھی اٹھی تو جموں کا آدھا شہر ارتھی کے ساتھ تھا۔ جب ہم ریذیڈنسی روڈ سے نکل کر دریائے توی کے کنارے جوگی دروازے کے شمشان میں پہنچے تو وہاں سینکڑوں کی تعداد میں مرد اور عورتیں جمع تھیں۔ شیل کے والد بھی موجود تھے۔ انھوں نے بہت ہی قیمتی شال ارتھی پر ڈالی تھی۔ میں نے دیکھا وہ الگ کھڑے رو رہے تھے اور شیل انھیں بھی سنبھال رہی تھی۔ خوشی کے مواقع آپسی اختلافات کو مٹانے میں اتنی مدد نہیں کرتے جتنی کہ غم کے مواقع کرتے ہیں۔ خوشی ہمارا ساجھا ورثہ نہیں لیکن غم ضرور ہمارا ساجھا ورثہ ہے۔ زندگی ہمیں ایک دوسرے سے الگ کر دیتی ہے لیکن موت ہمیں جوڑتی ہے۔ اس لحاظ سے موت کی اہمیت زندگی سے زیادہ ہے۔ ہے تو یہ ایک بہت بڑا تضاد لیکن یہ بات میں اپنے تجربے کی بنا پر کہہ رہا ہوں۔

ہمارے گھر میں یہ پہلی موت تھی۔ میں اس المیے سے بڑا متاثر ہوا تھا۔ سبھی اخباروں میں میرے والد کی موت کی خبر چھپی تھی۔ تعزیت کے تار آتے جا رہے تھے۔ ماتم پرسی کے لیے لوگوں کا تانتا بندھا ہوا تھا۔ مجھے اس روز معلوم ہوا کہ میرے والد کا سرکل کتنا بڑا تھا۔ کریاکرم کے دن تو یوراج کرن سنگھ کے ساتھ بخشی غلام محمد اور بہت سے وزیر بھی آئے تھے۔ سب نے میرے والد کی شخصیت کی تعریف کی تھی اور گہرے دکھ کا اظہار کیا تھا۔ مجھے اپنے والد کی موت کے بعد معلوم ہوا کہ وہ شخص کتنی بڑی شخصیت کا مالک تھا۔ کاش میں اس حقیقت کو ان کی زندگی میں پہچان سکتا! لیکن انسانی زندگی کا ایک المیہ یہ بھی ہے کہ ہم اپنے نزدیک کے لوگوں کو ان کی زندگی میں وہ اہمیت نہیں دیتے جس کے وہ حقدار ہوتے ہیں۔ بلکہ انھیں نظرانداز کرتے رہتے ہیں۔ اور جب موت انھیں ہم سے چھین لیتی ہے تو ہمیں اچانک ان کی عظمت کا احساس ہونے لگتا ہے۔ زندگی ہمیں ہماری اہمیت سے محروم کرتی ہے اور موت ہمیں عظمت عطا کرتی ہے۔ اپنے والد کی موت کے بعد مجھے اس حقیقت کا بڑا تلخ احساس ہوا۔

ماں کو اتنا صدمہ ہوا کہ وہ کئی روز تک ذہنی طور پر غیر متوازن رہیں۔ شیل اور میں بہت کوشش کرتے کہ اس کے سوچنے کا انداز بدلے۔ لیکن ہم کامیاب نہ ہوتے۔ ماں بیحد ڈپریسڈ تھی اور صرف اپنے آپ سے ہی نہیں بلکہ ہم سب سے بے نیاز ہوتی جا رہی تھی۔ سرفراز جو اس سے

اتنا اٹیچڈ تھا اپنی دادی کی توجہ سے ایکدم محروم ہو گیا تھا۔ اکیلی بیٹھی جانے کیا سوچتی رہتی تھی۔ وہ ۔میں اب کہیں باہر بھی نہیں جاتا تھا کہ میری غیر حاضری میں ماں جانے کیا کر بیٹھے۔ کئی مہینوں تک ماں کی یہی حالت رہی۔ ڈاکٹر برکت رام کے بعد میں نے اسے اور بھی کئی ڈاکٹروں کو دکھایا لیکن اُس کا مرض کوئی نہ پہچان سکا۔ مجھے یہ کہتے ہوتے ڈر لگنے لگا تھا کہ میری ماں نیم پاگل ہو گئی تھی۔

ایک رات جانے کیا ہُوا کہ اُس نے زاروقطار رونا شروع کر دیا بشیل نے اور میں نے بہت سنبھالا لیکن وہ تو سنبھلنے میں آتی ہی نہ تھی۔ سرفراز نے بڑی منتیں کیں لیکن اس پر تو کسی کی بھی بات کا اثر نہ تھا۔ آخر میں نے ڈاکٹر کو بُلوایا اور اُس نے نیند کا انجکشن دے کر اُسے سُلا دیا۔ لیکن آدھی رات کے بعد اُس کی نیند ٹوٹ گئی اور اُس نے اپنے آپ سے باتیں کرنا شروع کر دیں۔ میں ساتھ ہی کے کمرے میں تو سویا ہوا تھا۔ سرفراز کا تو الگ کمرہ تھا تیسری منزل پر۔ اس لیے اُسے کچھ بھی معلوم نہ تھا۔ رشیل نے مجھے جھنجھوڑ کر جگایا۔ میں لپک کر ماں کے کمرے میں پہنچا۔ وہ ایکدم بے ربط باتیں کر رہی تھیں اپنے آپ سے اور کبھی کبھی میرے والد سے مخاطب ہو کر بڑبڑانے لگتی تھی۔ سچی بات تو یہ ہے کہ میں خود ڈر گیا تھا۔ وہ بھی ڈر رہی تھی شاید۔ ایک تو گُپ اندھیرا اور اس کے ساتھ ہی ماں کی بے ربط باتوں کا ہلکا ہلکا شور۔ رشیل نے خوف کے غلبے کے زیر اثر کمرے کی بجلی جلا دی۔ روشنی ہونے کی دیر تھی کہ ماں کی حالت ایکدم بدل گئی۔ اس نے چیخ کر جانے کسے مخاطب کیا۔

"تم اگر نہیں چاہتے کہ میں یہاں رہوں تو میں کل ہی یہاں سے چلی جاؤں گی۔" میں نے آگے بڑھ کر ماں کو اپنی بانہوں میں لے لیا۔

"کوئی سپنا دیکھ رہی تھیں آپ؟"

میری بات سُن کر اس نے بڑی عجیب نظروں سے دیکھا۔

"کون ہو تم"

"میں آپ کا بیٹا ہوں۔"

"میرا کوئی بیٹا نہیں۔ اسے مرے ہوئے تو کئی برس ہو گئے۔"

"کیا کہہ رہی ہیں آپ؟ آپ ہوش میں نہیں ہیں کیا؟"

"تو کون ہے؟"

"میں رشیل ہوں، آپ کی بہو۔"

"تم وہی ہو جو میرے بیٹے کو بھگا کر لے گئی تھی۔"

"میں اسے لے گیا تھا بھگا کر، ماں۔"

"تمہارا باپ تو تمہیں قید کروانا چاہتا تھا۔ میں نے ہی روکا تھا اُسے۔"

"میں یہیں آپ کے سامنے بیٹھتا ہوں، آپ سو جائیے۔" میں نے کہا۔

"میں بجلی بجھا رہی ہوں۔" شیل نے کہا۔

"بجلی مت بجھانا۔ وہ پھر میرے سرہانے کھڑا ہو جائے گا اور میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے اپنے ساتھ کھینچنے لگے گا۔"

"نہیں بجھاؤں گی، ماں جی۔"

"مجھے ہری دوار لے چلو۔ میں گنگا میں نہانا چاہتی ہوں۔ اپنے سارے پاپ دھونا چاہتی ہوں۔"

"ہم کل ہی چل پڑیں گے۔" میں نے کہا۔

"نہیں ابھی لے چلو مجھے۔"

"ماں جی ابھی تو آدھی رات ہوئی ہے۔ کل صبح ہی ہم لوگ ہری دوار کے لیے روانہ ہو جائیں گے۔"

"مجھے تم پر اعتبار نہیں۔ تم جھوٹ بولتی ہو۔"

"مجھ پر تو اعتبار ہے؟"

"نہیں تم خراب آدمی ہو۔ لڑکیوں کو بھگاتے ہو۔"

"تو اپنے پوتے کو ساتھ لے لو۔"

"حاضر کرو اُس کو۔ آدھی رات تک کہاں گھوم رہا ہے۔"

"وہ تو اپنے کمرے میں سو رہا ہے، ماں جی۔"

"اسے جگا کر یہاں لے آؤ۔"

"ابھی لاتی ہوں، ماں جی۔" شیل یہ کہہ کر سیڑھیاں چڑھ کر اوپر چلی گئی۔

"تم یہ مکان بیچ دو۔ تمہارا باپ بھوت بن کر یہاں ڈیرہ ڈالنا چاہتا ہے۔"

"کیا کہہ رہی ہیں آپ؟"

"ٹھیک ہی کہہ رہی ہوں۔ یہاں رہو گے تو تم سب نشٹ ہو جاؤ گے۔"

سرفراز آنکھیں ملتا ہوا، رشیل کے ساتھ جب کمرے میں داخل ہوا تو ماں اُس سے مخاطب ہوئی۔

"کم سویا کرو۔ کوئی اُٹھا کر لے جائے گا۔"

"کسی کی ہمت ہے دادی جی؟"

"کل میرے ساتھ ہری دوار جا رہے ہو نا؟"

"جا رہا ہوں دادی جی۔"

"تمہارے ماں باپ میں سے کوئی ہمارے ساتھ نہیں جائے گا۔"

"کوئی نہیں جائے گا۔ اب آپ سو جائیے۔ صبح جلدی جاگنا ہوگا۔"

"اچھا۔"

"بجلی بجھا دُوں؟"

"نہیں۔"

ہم سب ماں کے کمرے سے باہر آ گئے۔ رشیل اور سرفراز کو میں نے اُن کے کمروں میں بھیج دیا اور میں دروازے کے باہر دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑا ہو گیا۔ اور اس طرح چُپ چاپ کافی دیر تک کھڑا رہا میں اس وقت وہاں سے ہٹا جب ماں سو گئی۔ اس کے کمرے کی روشنی میں نے جلتی ہی رہنے دی۔

جموں کے بڑے گھرانے کی عورتوں کو ایک وہم تھا۔ وہ یہ کہ گھر کی بہو سب سے پہلے جاگے اور رسوئی میں نہا دھو کر داخل ہو۔ یہ نہیں کہ وہ رات کے اشدھ کپڑے پہنے ہوتے ہی رسوئی کا کام شروع کر دے۔ اس وہم میں رشیل کی اور میری ماں بھی شامل تھی۔ ایک وہم اور تھا ان بڑے گھروں کی بزرگ عورتوں کو۔ سونے سے پہلے گھر کی بہو ساس کے پاؤں ضرور دباتے اور پھر سونے سے پہلے اُس کے پاؤں پر ماتھا ضرور ٹیکے۔ ان گھرانوں میں پاؤں دبانے کا کام تو اب نوکرانیوں کے ذمے لگ گیا تھا، لیکن سونے سے پہلے بہو کے ساس کے پاؤں پر ماتھا ٹیکنے کا رواج اب بھی جاری تھا۔ میرے لئے تسکین کی بات یہ تھی کہ میری ماں نے اس رواج کو ختم کر دیا تھا۔ البتہ یہ ضروری تھا کہ رشیل سب سے پہلے اُٹھے اور نہا دھو کر رسوئی میں جائے۔ جب سے ہم اپنے گھر میں آئے تھے بِنا کسی کے کہنے سے رشیل نے صبح سویرے جاگنا اور پاٹھ کرنا شروع کر دیا تھا۔ میں جب ابھی بستر میں کروٹیں بدلتا ہوتا رشیل تر و تازہ ہو کر چائے کی پیالی تپائی پر رکھ دیتی۔ سچ مانو تو مجھے بھی اس کا صبح سویرے اس طرح سنورنا اچھا لگنے لگا تھا۔ صبح سویرے کسی اچھی شکل کو دیکھ کر دِن کا آغاز کرنا، یوں بھی تو شُبھ مانا جاتا ہے۔

اگلی صبح جب شیل روزمرہ کی طرح نہا دھو کر ماں کے کمرے میں گئی' یہ پوچھنے کے لیے کہ وہ اس کے لیے چائے لے آئے، تو اُس نے دیکھا کہ ماں تو پلنگ کی ایک طرف لڑھکی ہوئی تھی۔ شیل نے ماں کو سہارا دے کر اسے ٹھیک طرح سے لٹانے کی کوشش کی تو اس کے مُنہ سے زور کی چیخ نکل گئی۔ ماں تو ہمیں چھوڑ کر جا بھی چکی تھی اور ہم میں سے کسی کو خبر بھی نہ ہوئی تھی۔ اُس کے کمرے کی روشنی رات بھر جلتی رہی تھی اور وہ اُس روشنی کی مدد سے فضا کی تاریک راہوں کی طرف بڑھ گئی تھی۔ شیل کی چیخ سُن کر میں بھی ماں کے کمرے میں آ گیا۔ ماں کے چہرے کو دیکھ کر یہ لگتا تھا کہ وہ بہت دیر تک موت سے لڑتی رہی تھی۔ لیکن حیرت کی بات یہ تھی کہ اس نے کسی کو آواز نہیں دی تھی حالانکہ شیل اور میں تو ساتھ والے کمرے ہی میں تھے۔ تھوڑی دیر میں سرفراز بھی اوپر والی منزل سے آ گیا اور آتے ہی ماں کے پاؤں پر گر گیا۔

"میں تو آپ کو ہری دوار لے جانے کے لیے آیا تھا' دادی جی۔"

"وہ اکیلی ہی چلی گئی ہیں بیٹے۔" شیل نے اُسے اُٹھاتے ہوئے کہا۔

"ہم میں سے کسی کا بھی ساتھ جانا اُسے پسند نہیں تھا۔" میں نے بہت دیر تک اپنے آپ پر قابو رکھا تھا لیکن آخر میرا ضبط بھی ٹوٹ گیا تھا۔

"اب تم اس کی استھیاں لے کر جانا ہری دوار۔" شیل نے سرفراز کو اپنے سینے سے لگاتے ہوئے کہا اور پھر زور زور سے رونے لگی۔

دوپہر کے بعد جب ہم لوگ ماں کو شمشان میں آگ کے سپرد کر کے گھر لوٹے تو مجھے محسوس ہوا کہ اب وہاں کچھ بھی باقی نہیں بچا تھا۔ بہت کچھ تو میرے والد کے ساتھ ہی چلا گیا تھا۔ جو کچھ رہ گیا تھا اُسے ماں ساتھ لے گئی تھی۔ صرف کمرے' دیواریں' کواڑ اور چھتیں رہ گئی تھیں اب۔ گھر تو سارے کا سارا لُٹ چکا تھا۔

کریا کرم کے روز تک ماں کے کمرے میں جوت جلتی رہی اور گرڑ پُوران کی کتھا ہوتی رہی اور پھر ایک شام کو ماتم کی صف بھی اُٹھا دی گئی۔

ایک نسل کا دوسری نسل سے رشتہ ایکدم منقطع ہو گیا تھا۔ انسانی رشتے تو درختوں کی شاخوں کے سمان ہیں۔ شاخیں کٹتی رہتی ہیں اور درخت اُجڑتے رہتے ہیں اور پھر ایک لمحہ ایسا بھی آ جاتا ہے جب درخت کا آخری تنا بھی سُوکھ جاتا ہے اور پھر اُسے بھی کاٹ دیا جاتا ہے اور اُس کے بڑے بڑے ٹکڑے شمشان میں کسی شخص کو جلانے کے لیے استعمال ہوتے ہیں۔ رشتوں کے

درخت کٹنے اور شمشان میں استعمال ہونے کا یہ عمل ہزاروں بلکہ لاکھوں سالوں سے جاری ہے اور جب تک ایک نسل کا رشتہ دوسری نسل سے جڑا رہے گا یہ عمل اپنی نپی تلی رفتار سے جاری رہے گی اور اس عمل کی گواہیاں تاریخ کے اوراق میں درج ہوتی رہیں گی اور پھر ان اوراق کو بھی دیمک چاٹ جائے گی اور پہلی تاریخ کی جگہ کوئی دوسری تاریخ مرتب ہوگی۔ پھر تیسری، چوتھی، پانچویں اور اس طرح بے شمار تاریخیں مرتب ہوتی رہیں گی اور ہر نسل کو اس کی تاریخ اُس کے حوالے کر دی جاتی رہے گی۔

فنا اور بقا کا یہ تسلسل کتنا الجھا ہوا لیکن کتنا واضح بھی ہے!

آدھی رات کا سمے تھا۔

سرفراز اوپر والی منزل سے گھبرایا ہوا ہمارے کمرے میں آیا تھا۔

"کیا بات ہے سرفراز؟"

"دادی مجھے جھنجھوڑ کر جگا رہی تھی۔ کہہ رہی تھی میں اسے ہری دوار کیوں نہیں لے گیا۔"

"سپنا دیکھا ہوگا بیٹے۔" رشیل ہڑبڑا کر اٹھی اور سرفراز کو اپنے ساتھ چمٹا لیا۔

"سپنا نہیں تھا ممی۔ دادی سچ مچ مجھے جگا رہی تھیں۔"

"تم کل سے اوپر والے کمرے میں مت سویا کرو۔" میں نے کہا

"اب یہیں سو جا تو میرے پلنگ پر۔" رشیل نے اس کی پیٹھ سہلاتے ہوئے اصرار کیا۔ ڈرا اور سہما ہوا سرفراز ماں کے پلنگ پر لیٹ گیا اور اپنی ممی کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا، جس سے اُسے تحفظ کا احساس ہو رہا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ سو گیا۔ اس طرح کے سانحے مجھے اور رشیل کو لگاتار پیش آتے۔ دو ایک بار سرفراز کے ساتھ پھر ایسا ہوا۔ ایک دن جب سرفراز گھر پر نہیں تھا ہم دونوں نے اس معاملے پر گہرائی سے سوچا۔

"لگتا ہے ماں کی گتی نہیں ہوتی۔ ورنہ وہ اس طرح گھر کے چکر نہ لگاتے۔" رشیل نے بات شروع کی۔

"مجھے بھی ایسا ہی لگتا ہے۔"

"تو کیا کرنا چاہیئے؟"

"پنڈتوں نے تو جو بھی کہا وہ ہم نے کیا ہے۔ کسی اور سے پوچھ لو۔"

"پتا جی کے مرنے کے بعد تو ماں نے بھی یہی رٹ لگا رکھی تھی کہ ہم اس گھر کو چھوڑ دیں۔ یہ گھر

بھوتوں کا ڈیرہ بن جائے گا۔"

"میں تو اسے مذاق سمجھ کر ٹال دیتا تھا۔"

"بھوتوں کا ڈیرہ بننے میں کسر بھی کیا رہ گئی ہے اب۔ میں تو کبھی کسی اندھیرے کمرے میں جاتی ہوں تو مجھے ڈر لگنے لگتا ہے۔"

"اب اگر اپنے ہی گھر میں ڈر لگنے لگے تو وہاں رہنے کا کیا فائدہ؟"

"تو کیا کریں؟"

"میں تو سوچتی ہوں کہ مکان کو بیچ دیں اور دہلی چلے جائیں۔ جموں میں ہمارا رہ بھی کیا گیا ہے اب؟"

"تمہارے ماں باپ تو ہیں۔"

"ان کے بارے میں تو میں اب سوچتی ہی نہیں۔"

"لیکن رشتہ تو تمہارا ہے ہی ان سے۔"

"اس طرح کے رشتے تو بوجھ بن جاتے ہیں۔ صرف دکھاوا ہوتا ہے اور کیا رہ جاتا ہے۔"

"پھر بھی ماں باپ کا رشتہ تو بڑی اہمیت رکھتا ہے۔"

"میرے لیے اب اس رشتے کی کوئی زیادہ اہمیت نہیں رہی۔ میں تو اب اس شہر سے ہی بیزار ہو گئی ہوں۔"

"جموں شہر سے؟"

"ہاں۔ اب تو یہ شہر بھی مجھے بھوتوں کا ڈیرا لگنے لگا ہے۔"

شیل کی اس بات نے مجھے واقعی چونکا دیا۔ اس قسم کی بات اُس نے پہلی بار کی تھی۔ مجھے یقین ہو گیا کہ اب وہ بھی یہاں نہیں رہنا چاہتی تھی۔

میں کئی روز سوچتا رہا کہ کیا ہمیں یہ مکان بیچ دینا چاہیے۔ مکان بیچ کر جائیں گے کہاں؟ انہی دنوں گندوترا اُودھم پور سے آ گیا۔ میں نے اُس سے کھل کر بات کی۔ اس کا بھی یہی مشورہ تھا کہ مکان بیچ دیا جائے اور چونکہ میرا زیادہ وقت دہلی میں گزرتا تھا، وہیں اپنے گزارے لائق کسی اچھی سی لوکیلٹی میں ایک مکان خرید لیا جائے بلکہ اس نے تو یہ بھی کہا کہ وہ ہمارا مکان خریدنے کے لیے کوئی گاہک بھی تلاش کرے گا۔ ایک دو پارٹیاں اُودھم پور

میں تھیں جو جموں میں کوئی اچھا سا مکان خریدنا چاہتی تھیں۔

اس دوران میرے دو تین چکر دہلی کے لگے۔ میں نے اپنے دوستوں سے دہلی میں مکان خریدنے کا ذکر کیا تو وہ بہت خوش ہوتے۔ اُن دنوں حوض خاص اینکلیو میں مکان بِک بھی رہے تھے۔ بس تین مہینے کے اندر اندر گندوترا نے ہمارا مکان بکوادیا اور میرے ساتھ دہلی جاکر حوض خاص اینکلیو میں ایک مکان کا سودا بھی کروا دیا۔

گندوترا نے ہی دو ٹرکوں کا انتظام کرکے ہمارا سامان بھی دہلی پہنچوادیا۔ ایک ٹرک کے ساتھ وہ خود بھی آگیا اور دو تین دن ہمارے ساتھ رہا۔ ہمیں نئے گھر میں سیٹل بھی کروا دیا اُس نے۔

حوض خاص اینکلیو میں کئی کشمیری فیملیز بھی رہتی تھیں۔ اُن سے بھی ملاقات ہوگئی۔ سُبھاشنی بھی اب ایک ایڈوکیٹ سے شادی کرکے دہلی میں سیٹل ہوگئی تھی اور سپریم کورٹ میں پریکٹس بھی کررہی تھی۔

تھوڑے ہی دنوں میں دہلی میں بھی ہمارا ایک گروپ بن گیا جو میرے جرنلزم والے گروپ سے مختلف تھا۔ اب میں نے اپنی پوری توجہ جرنلزم والے گروپ کی طرف مبذول کردی تھی۔ سرفراز اب سینئر کیمبرج میں تھا اور اسے بھی ایک بہت اچھی انسٹی ٹیوشن میں داخلہ مل گیا تھا۔

گندوترہ سے طے ہوا تھا۔ وہ مہینے میں کم سے کم ایک چکر دہلی کا ضرور لگایا کرے گا۔ سُبھاشنی کے دہلی میں ہونے سے شیل کو بھی اجنبیت کا احساس نہیں رہا تھا۔

دہلی میں مستقل طور پر آجانے سے میں جرنلزم کی مین سٹریم میں شامل ہوگیا۔ ایک نیشنل انگریزی روزنامے میں بحیثیت ایک کالم نگار میں نے کام شروع کردیا اور فری لانسنگ بھی جاری رکھی۔ جرنلسٹس نے ایک طرح سے مجھے کشمیر کی سیاست کا ایکسپرٹ مان لیا۔ اس لیے پریس کانفرنسوں میں میری شرکت زیادہ ہوگئی۔ میں نے پنڈت نہرو کی پریس کانفرنسوں کی رپورٹنگ بھی شروع کردی اور انھیں ہر سطح پر سراہا بھی گیا۔ پنڈت نہرو سے میری ذاتی ملاقاتیں بھی ہوئیں اور مجھے یہ جان کر بے حد خوشی ہوئی کہ وہ اپنے کشمیری ہونے پر فخر کرتے تھے اور اُن کی ہمیشہ ہی یہ کوشش رہتی تھی کہ ریاست جموں وکشمیر کے مفاد کو نقصان نہ پہنچے۔ اُن ہی دنوں پنڈت نہرو کو جو سب سے بڑا صدمہ ہوا وہ چینی فوجوں کا لداخ اور نیفا پر اچانک حملہ تھا جو این لائی سے دوستی کا ہاتھ بڑھانے کے بعد "ہندی چینی بھائی بھائی" کا خوبصورت نعرہ ایک لرزہ خیز بم کے دھماکے میں بدل گیا تھا اور سارا ہندوستان اس کی آواز سے متاثر ہوا تھا۔ اس موقع پر نہرو کی تقریر جو انھوں نے ریڈیو پر کی تھی

دو ملکوں کی دوستی کا نوحہ تھا۔ پنڈت نہرو کی آواز بھرّائی ہوئی تھی۔ چینیوں کے اس وشواس گھات نے انھیں ناقابلِ برداشت اذیت پہنچائی تھی۔ اخبارات میں چین کے خلاف بڑا غم وغصہ تھا اور اس کے ساتھ ڈیفنس منسٹر کرشنا مینن کی نکتہ چینی کی جا رہی تھی جو پنڈت نہرو کو اپنی فوجی طاقت کے کے بارے میں مبالغہ آمیز اطلاعات دیتا رہا تھا۔ سارا ملک اپنے چھوٹے موٹے اختلافات کو بھلا کر اس نازک وقت میں ایک ہو گیا تھا۔ لیکن اس سے چین کے فوجی حملوں پر کوئی اثر نہ پڑا تھا۔ آخر ایک ماہ کے جارحانہ حملے اور ہندوستان کی فوج کو بڑی نقصان پہنچانے کے بعد اُس نے خود ہی لڑائی بند کر دینے کا اعلان کر دیا تھا۔ پنڈت نہرو کو اس حملے کا اتنا شدید صدمہ ہوا کہ ذہنی اور جسمانی طور پر وہ ایکدم لڑکھڑا گئے۔

ان دنوں اس موضوع پر طرح طرح کی قیاس آرائیاں کی جا رہی تھیں کہ پنڈت نہرو کا جانشین کون ہوگا؟ سیاسی حلقوں میں اور پریس میں بھی اس بات کے بڑے چرچے تھے۔ لیکن اچانک ایک اور سیاسی دھماکا ہوا جس کا کچھ اور ریاستوں کے ساتھ جموں وکشمیر پر بہت گہرا اثر پڑا۔ کے۔ کامراج کو پنڈت نہرو تامل ناڈو سے دہلی لے آئے تھے اور انھیں انڈین نیشنل کانگریس کا سربراہ بنا دیا تھا۔ کامراج بہت پڑھا لکھا آدمی تو نہیں تھا لیکن اس کا سیاسی شعور بڑا پختہ تھا اس نے پنڈت نہرو کے سامنے ایک تجویز رکھی جس کا نام کامراج پلان تھا اس کی رُو سے گورنمنٹ آف انڈیا کے کچھ وزیروں اور ریاستوں کے کچھ وزرائے اعلا کو مستعفی ہو کر پارٹی کو مضبوط کرنے کے لیے کام کرنا تھا۔ دراصل یہ ایک گہری سیاسی چال تھی، جسے بہت سے سیاستدان اُس وقت نہ سمجھ سکے تھے۔ نتیجے کے طور پر ریاستوں کے چھ چیف منسٹروں نے اپنے اپنے استعفے دے دیئے۔ ان میں بخشی غلام محمد بھی شامل تھا۔ یہ خبر اتنی غیر متوقع تھی کہ مجھے کئی بار اس کی تصدیق کرانی پڑی۔ بخشی غلام محمد کے حمایتوں نے کشمیر میں بہت کوشش کی کہ اُس کا استعفیٰ کسی طرح منظور نہ ہو۔ لیکن اخبارات کی خبروں کے مطابق بخشی غلام محمد اس پر راضی نہ ہوا۔

وزیرِ اعظم کی عہدہ سے سبکدوش ہونے سے پہلے اس نے آئین ساز اسمبلی میں دو بہت ہی اہم سیاسی قسم کے اعلان کئے۔ ایک اعلان یہ تھا کہ صدر ریاست کا عہدہ گورنر میں بدل دیا گیا تھا اور وزیرِ اعظم کو دوسری ریاستوں کی طرح کشمیر میں بھی وزیرِ اعلا کے عہدے میں تبدیل کر دیا گیا تھا۔ دوسرے اعلان کی رُو سے پارلیمنٹ کے لیے الیکشن ہوں گے اور کسی کو نومی نیٹ نہیں کیا جائے گا۔ ان اعلانات نے بخشی غلام محمد کو سیاسی طور پر بڑا مضبوط کر دیا۔ اس کا انجام یہ ہوا کہ جی ایم صادق

جو سیاسی طور پر کافی مضبوط تھا وزیر اعلا بننے میں کامیاب نہ ہو سکا اور بخشی غلام محمد اپنی وزارت کے وزیر مال خواجہ شمس الدین کو ریاست جموں و کشمیر کا وزیر اعلا بنانے میں کامیاب ہو گیا۔
جس روز صدر ریاست نے خواجہ شمس الدین کو وزیر اعلا کا حلف دلایا کسی کو بھی اس کا یقین نہ آیا۔ لیکن یہ حقیقت تھی کہ بخشی غلام محمد نے ایک اور کامیاب سیاسی چال چل دی تھی۔ میں نے اس روز اپنے کالم میں اپنے اس خیال کا کھُل کر اظہار کیا تھا کہ بخشی غلام محمد نے اپنی دس سال کی حکومت کے ختم ہونے پر سیاست میں جو تبدیلی کی تھی، وہ بہت کامیاب نتائج کی حامل نہیں ہو گی اور خواجہ شمس الدین زیادہ عرصہ تک اپنے عہدے پر قائم نہ رہ سکے گا۔ کئی اور جرنلسٹ دوستوں نے بھی اسی قسم کی رائے کا اظہار کیا تھا۔

۱۱

کچھ ماہ پہلے ڈُون، مبارک اور بختاں والی دہلی آئے تھے۔ ڈُون کئی بہت بڑھیا شال شیل کے لیے لائی تھی۔ سرفراز کے لیے نہایت نفیس قسم کی سلک لائی تھی، اُس کی قمیضوں کے لیے اور میرے لیے پشمینے کی ایک خوبصورت چادر۔
سرفراز نے بختاں والی کو جی بھر کر دہلی میں گھمایا اور اُسے جی بھر کر پر چیزیں خریدوائیں۔ جتنے روز وہ لوگ ہمارے گھر رہے، محلے والے بختاں والی کو دیکھنے کسی نہ کسی بہانے گھر آجاتے رہے۔ بلکہ ایک بارسوخ اور امیر گھر سے تو بختاں والی کے لیے شادی کا پیغام بھی آگیا۔ جب ڈُون نے کہا کہ وہ اس کی شادی پہلے ہی طے کر چکے تھے تو وہ لوگ بہت مایوس ہوئے۔ لڑکے کی ماں نے یہاں تک کہہ دیا۔
"اگر اس سلسلے میں کسی بڑے آدمی کی سفارش سے کام چلتا ہو تو ہم سفارش بھی کرا دیں۔"
"شادی کوئی ٹھیکے داری تو نہیں جس کے لیے سفارش کی ضرورت پڑتی ہو۔ یہ تو بالکل ذاتی معاملہ ہوتا ہے۔"
وہ عورت بڑی شرمندہ ہوئی اور مایوس لوٹ گئی۔
اگر ہم لوگ ہندو نہ ہوتے تو سبھی یہ اندازہ لگا لیتے کہ بختاں والی کی شادی سرفراز سے ہی ہو گی۔

دہلی میں ایک بہت بڑی نمائش لگنے والی تھی اور مبارک اس نمائش میں اپنے لیے ایک سٹال لینے آیا تھا۔ بہت لوگ دوڑ دھوپ کر رہے تھے۔ سرینگر کی کئی دوسری پارٹیاں بھی سٹال لینے کی کوشش میں تھیں۔ مبارک کو زیادہ لوگ نہیں جانتے تھے، اس لیے وہ بہت پُرامید نہیں تھا۔ اتنے برسوں میں جرنلزم سے وابستہ رہنے سے ایک سرکل میرا بھی تو بن گیا تھا۔ ادھر سرفراز نے بھی اپنے کونٹیکٹس بنا لیے تھے۔ ہم لوگ نمائش گاہ میں ایک بڑا سٹال مبارک کے لیے لینے میں کامیاب ہو گئے۔ مبارک اُس دن بہت خوش تھا۔

میں آپ سے ایک بات کہنا چاہتا تھا لیکن اب تک ہمت نہیں ہوئی۔

"کہو مبارک، ایسی کون سی بات ہے، جسے مجھ سے کہنے کے لیے تمہیں ہمت کی ضرورت ہے۔"

"کچھ ایسی ہی بات ہے۔"

"تو کہہ ڈالو آج۔"

اُسی لمحہ ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ میں ٹیلی فون سُننے کے لیے اُٹھا۔ اگلے دن ایک پریس کانفرنس تھی۔ مجھے اس میں جانے کے لیے اِصرار تھا ایک دوست کا۔ جب میں ٹیلی فون سُن کر واپس صوفے پر بیٹھا تو سرفراز اور بختاں والی دونوں داخل ہوئے۔

"چچا جان، سرفراز کہہ رہا ہے میں اب سرینگر واپس نہ جاؤں اور یہیں رُک جاؤں۔"

"کیوں سرفراز، ٹھیک کہہ رہی ہے بختاں والی؟"

"ہاں پاپا۔ میں اسے اپنا پارٹنر بنانا چاہتا ہوں۔"

"اپنے کاروبار میں؟"

"ہاں پاپا۔"

"کس کاروبار میں؟

"بختاں والی پارٹنر بن جاتے تو پھر کاروبار کے بارے میں طے کروں گا۔"

"تم میرا کاروبار کیوں نہیں سنبھال لیتے"۔ مبارک نے تجویز رکھی۔

"شالوں کا کاروبار چچا جان؟

"ہاں۔ تم کون سا کاروبار شروع کرنا چاہتے ہو؟"

"تو پہلے سوچ لو برخوردار پھر بات کرنا۔" میں نے اُس کا کندھا تھپتھپاتے ہوئے کہا

اور وہ سر جھکائے کمرے سے باہر نکل گیا۔

"میں بھی جاؤں، چچا جان؟" بختاں والی نے میری طرف دیکھ کر پوچھا۔ کتنی خوبصورت اور معصوم لگ رہی تھی وہ۔ برسوں پہلے کی ڈُون مجھے یاد آگئی جو ہاؤس بوٹ میں کتنی دن تک ہماری دیکھ بھال کرتی رہی تھی۔ یہ اُن دنوں کی بات تھی جب شیلا اور میں جموں سے بھاگ کر سرینگر گئے تھے اور ہمارے ساتھیوں نے چندہ اکٹھا کر کے ہمیں ہنی مون منانے کے لیے سرینگر بھیجا تھا۔ میں پل بھر کو ٹھٹھک گیا۔

"جاؤں چچا جان؟"

"کہاں جاؤ گی بیٹی؟"

"اپنے کمرے میں۔" اُس نے اتنے سکون اور شائستگی سے جواب دیا کہ مجھے ہنسی آگئی۔

"میں نے سوچا سرینگر واپس جانے کے لیے پُوچھ رہی ہو۔"

"نہیں چچا جان۔"

وہ ہنستی ہوئی اپنے کمرے میں چلی گئی تو میں نے مبارک سے کہا۔

"جانتے ہو میں لمحہ بھر کے لیے کیوں خاموش ہو گیا تھا؟"

"کیوں؟"

"مجھے لگا جیسے برسوں پہلے کی ڈُون میرے سامنے کھڑی تھی اور مجھ سے اپنے ڈونگے میں جانے کی اجازت مانگ رہی تھی۔"

"لیکن اب تو ڈُون ہڈیوں کا ڈھانچہ بن گئی ہے۔"

"قدرت کے رنگ بڑے نرالے ہیں۔ ایک پھُول مرجھانے لگتا ہے، تو شاخ پر ایک چھوٹی سی کلی، اپنا سر پتّوں کے درمیان سے نکال کر پوچھتی ہے۔ کیا میں اس پھُول کی ذمہ داری سنبھال لوں؟"

"بہت ٹھیک کہہ رہے ہیں آپ۔"

"لیکن تم اپنی بات تو کہو۔"

"اب نہیں کہوں گا۔ وہ لمحہ بہت آگے نکل گیا ہے، جو لمحہ میری بات کے لیے مناسب لمحہ تھا۔"

میں نے بہت اصرار کیا تھا لیکن مبارک نے پھر اپنی بات نہیں کہی تھی۔ مبارک،

ذُون اور بختاں والی واپس سرینگر چلے گئے۔ مبارک جاتے ہوئے یہ وعدہ کر گیا کہ نمائش کے لیے سامان لےکر وہ بیس روز کے بعد دہلی آئے گا۔

"بختاں والی کو بھی ساتھ لاؤ گے نا؟"

"وہ آنا چاہے گی تو ضرور لاؤں گا۔"

سرفراز نہال ہو گیا۔ وہ اور بختاں والی دو دوستوں کی طرح پل پھر ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے ہمارے سامنے کھڑے رہے۔

ہم لوگ انھیں ایرپورٹ پر چھوڑنے گئے اور پیسنجر لاونج تک ان کے ساتھ رہے۔ ذُون اندر جانے سے پہلے ایک بار میرے سینے سے لگ گئی اور پھر اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ جب رشیل نے اسے گلے لگا کر رخصت کیا تو جانے کیوں مجھے لگا کہ ہم لوگ ذُون کو آخری بار مل رہے تھے۔ اس کے چہرے پر لکھی جو عبارت میں نے پڑھی تھی، اس سے تو یہی معنی اخذ کیے تھے میرے دل نے۔ سرفراز جب ہمیں گھر واپس لایا تو وہ بھی بہت اُداس تھا۔ لگا جیسے ہمارا گھر ایکدم ویران ہو گیا تھا۔ کئی دنوں تک مجھے بختاں والی، ایک کمرے سے دوسرے کمرے میں جاتے ہوئے نظر آتی رہی۔ میں نے اس کا ذکر کسی سے نہیں کیا، رشیل سے بھی نہیں۔ یہ تو ایک دم پاگل پن کی بات تھی!

مبارک سرینگر جا کر پھر نہیں لوٹا۔

میں کوئی مورخ نہیں ہوں، ایک عام آدمی ہوں اور ایک معمولی سا جرنلسٹ ہوں۔ میں ریاست جموں وکشمیر کی تاریخ مرتب نہیں کر رہا۔ میں ایک طرح سے اپنی کہانی کہہ رہا ہوں۔ جو رشیل کی اور سرفراز کی، ذُون اور رمضان جُو کی، اس کی بیوی فاطمہ کی، مبارک اور بختاں والی کی کہانی بھی ہے اور اس میں وہ سب لوگ شامل ہیں، جو کسی نہ کسی طرح سے میرے ساتھ وابستہ رہے ہیں۔ اسی لیے میں کشمیر کے وزیراعظموں اور ان کے سیاسی گٹھ جوڑوں اور اُن کے جانشینوں کا ذکر نہیں کروں گا۔ کشمیر کا سماجی اور سیاسی پس منظر جاننے کے لیے جتنا ضروری تھا اتنا کہہ چکا ہوں۔ بس اتنا ہی ذکر کرنا کافی ہے کہ بخشی غلام محمد کے دس سال تک وزیراعظم

رہنے کے بعد خواجہ شمس الدین، جی، ایم صادق، غلام محمد شاہ جیسے کشمیری لیڈر اپنے اپنے سیاسی حربے استعمال کرتے ہوتے ریاست جموں وکشمیر کی وزارت اعلا سنبھالنے کے ساتھ اپنا اپنا رول نبھاتے رہے۔ اپنا اپنا کردار نبھانے میں ان سے کیا کیا غلطیاں سرزد ہوئیں۔ یہ تو مورخ ہی بتائیں گے۔ کیونکہ یہ مشکل کام انھیں کا ہے اور اس سے وہی عہدہ برا ہو سکتے ہیں۔

میں پھر یہ بات دوہرا رہا ہوں کہ میں مورخ نہیں ہوں۔ صرف ایک عام آدمی ہوں اور میری سوچ بھی ایک عام آدمی کی ہی سوچ ہے۔ جو بدقسمتی سے اس تحریک سے بھی وابستہ رہا ہے، جو بہت عرصہ تک بڑے زوروں سے چلی۔ اس تحریک کا مقصد کشمیر کے عام آدمی کی زندگی کو زیادہ خوبصورت، زیادہ پرسکون اور زیادہ خوشگوار بنانا تھا۔ لیکن ایک ایسا وقت آگیا جب یہ تحریک کچھ ایسے ہاتھوں میں آگئی جو اس کے حقیقی مقصد کو بھول گئے اور اس میں کچھ ایسے عناصر شامل کر دیے گئے جس سے تحریک کے پورے تصور ہی میں تضاد پیدا ہونے لگا۔ ایک بالکل ہی قسم کی قدروں کی آبیاری ہونے لگی، جن قدروں کی پوری تحریک میں کہیں جگہ نہ تھی۔

میں ان قدروں سے سمجھوتہ نہ کر سکا اور اس سے کٹ کر الگ ہو گیا جس کا بہت عرصہ تک مجھے افسوس رہا۔ وہ افسوس اب تک بھی قائم ہے جب تک سیاسی تحریکوں میں ایماندار اور کمیٹڈ لوگوں کی پوری وابستگی نہیں ہوگی۔ یہ تحریکیں ناکام ہوتی رہیں گی اور ان سے خاطر خواہ نتائج نہیں نکلیں گے۔

اتنے برسوں سے جو ایک مبہم سا ڈر میرے دل کے کسی کونے میں سویا پڑا تھا، دھیرے دھیرے آنکھیں ملتا ہوا جاگ اٹھا تھا۔ یہ بات الگ تھی کہ اس نے جاگنے میں کافی دیر لگائی تھی۔ میں نے اتنے برسوں تک اس غیر واضح خوف کے بارے میں کسی سے بات نہیں کی تھی۔ البتہ کبھی کبھی رشیل سے ضرور اس کا اظہار کیا تھا اور اب پچھلے کچھ عرصہ سے اس نے بھی میری ہی طرح سوچنا شروع کر دیا تھا۔ آج سے تقریباً چھتیس ۳۶، سینتیس ۳۷ سال پہلے جب شیخ عبداللہ نے خود مختار کشمیر کی بات اٹھانا شروع کی تھی اور کچھ بیرونی طاقتوں کے نمائندوں نے بھی دبی زبان میں اس کی حمایت میں بیان دیے تھے، تو مجھے محسوس ہونے لگا تھا کہ شیخ عبداللہ کے سوچنے کا یہ انداز، جو سراسر غلط تھا، کچھ اور لوگوں پر بھی تو اثرانداز ہو سکتا تھا۔ وادی کے کچھ لوگ اس طرح بھی تو سوچنا شروع کر سکتے تھے۔ ڈوگرہ راج ختم ہونے کے بعد اور پھر عوامی حکومتوں کے تھوڑی تھوڑی مدت کے بعد ٹوٹتے رہنے سے ایک غیر یقینی فضا پیدا ہو گئی تھی تمام ریاست میں۔ کچھ ایسا نظر

آنے لگا تھا کہ جموں میں رہنے والے لوگوں اور وادی کے باسیوں کے نظریوں میں فاصلہ بڑھنے لگا تھا۔ اس کا فائدہ ڈھکے چھپے طور پر تو سمندر پار کی طاقتوں نے اٹھایا تھا لیکن ہمارے بالکل پڑوسی ملک نے تو کھلم کھلا فرقہ پرستی کا زہر وادی کی صحت بخش ہواؤں میں گھولنا شروع کر دیا تھا' اپنے اخبارات کو' ریڈیو اور ٹیلی ویژن کو تو استعمال کر ہی رہا تھا ہمارا پڑوسی ملک، لیکن اس کے ساتھ اس نے جو بڑا ہی خطرناک حربہ استعمال میں لانا شروع کر دیا تھا' وہ تھا وادی کے مسلمان نوجوانوں کو اپنا نشانہ بنانا۔ سرحد پار سے گھس پیٹھئے چوری چھپے وادی کی حدوں میں داخل ہو رہے تھے اور وادی کے مسلم طبقے کو گمراہ بھی کر رہے تھے اور نوجوانوں کو اسلحہ بھی مہیا کرنے لگے تھے وادی کا سادہ' معصوم اور اقتصادی طور سے کمزور طبقہ پڑوسی ملک کی چالوں میں آنے لگا تھا۔ وہ انھیں روپے پیسے کا لالچ دے کر سرحد کے اس پار بھی لے جانے لگے تھے اور انھیں انتہا پسند رویہ اختیار کرنے پر اکسانے لگے تھے

کچھ دیر تو سرحد پر اکا دکا وارداتیں ہوتی رہیں۔ گھس پیٹھیے گرفتار بھی ہوتے رہے اور ہلاک بھی۔ لیکن پھر ایک ایسی بھی اسٹیج آگئی جب وہ لوگ وادی میں انتہا پسندوں کے چھوٹے چھوٹے گروپوں کو بھی آرگینائیز کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ عین اسی وقت کانگریس اور نیشنل کانفرنس میں اختلافات اس حد تک بڑھ گئے کہ فاروق عبداللہ کے لیے جواب ریاست کا وزیر اعلا تھا، سرکار چلانا مشکل ہو گیا۔ اپنی طرف سے اور اپنی فہم و فراست کے مطابق اس نے حالات کو قابو میں رکھنے کے لیے بہت کوشش کی لیکن وادی کا نظم و نسق دھیرے دھیرے بگڑنے لگا۔ وادی میں نراجیت کی سی کیفیت نظر آنے لگی۔ گورنمنٹ آف انڈیا بڑے مخمصے میں تھی۔ ریاست کے حالات تیزی سے بگڑتے جا رہے تھے۔ انھیں قابو میں لانا بہت ضروری ہو گیا تھا۔ ادھر سیاسی حلقوں میں فاروق عبداللہ کی سرکار کو ہٹانے کی مانگ روز بروز بڑھتی جا رہی تھی۔ عوام پریشان تھے۔ لوگوں کی اقتصادی حالت بھی خراب ہونے لگی تھی۔ لوگوں میں تحفظ کا احساس بھی کمزور ہونے لگا تھا۔ کشمیر کی خوبصورت وادی پر کڑا وقت آگیا تھا۔ کوئی بہت ہی سخت قدم اٹھانے کی ضرورت تھی۔ مزید تاخیر تو خطرے کا باعث بن سکتی تھی۔ ادھر دہلی میں بڑے گہرے مشورے ہو رہے تھے ادھر پڑوسی ملک کی غیر دوستانہ سرگرمیاں بڑھتی جا رہی تھیں۔ انجام کے طور پر فاروق عبداللہ کی سرکار ٹوٹ گئی اور ریاست جموں و کشمیر میں گورنری راج لاگو ہو گیا۔ کشمیر کی جس سیاست کے افسانے کا آغاز اس

کے والد نے کیا تھا اس کا آخری حصہ فاروق عبداللہ کے ہاتھوں لکھا گیا، جو ایک طرح سے کہانی کا اینٹی کلائمکس تھا۔ اِس اینٹی کلائمکس کی شروعات تو شیخ عبداللہ کے زمانے میں ہی ہو چکی تھی۔ انتہاپسندوں کی لگ بھگ اَدھی درجن کے قریب انجمنیں تھیں جو تخریبی کاموں میں جُٹی تھیں۔ لوگوں کو اغوا کر لیا جاتا تھا اور بعد میں قتل بھی کر دیا جاتا تھا۔ لُوٹ مار شروع تھی۔ اب تو انتہاپسندوں کی کارروائیاں گلی کُوچوں میں ہونے لگی تھیں۔ ان میں غیر سماجی عناصر بھی شامل ہو گئے تھے۔ وادی میں آمد و رفت کا سلسلہ ٹھپ ہوتا جا رہا تھا۔ اب ایک طرح سے وادی کو فوج کے حوالے کر دیا گیا تھا لیکن اس سے بھی تخریبی کارروائی میں کمی نہ ہو رہی تھی۔ پہلے تو یہ کارروائیاں سرینگر شہر کے ہی مختلف حصوں تک محدود تھیں۔ اب تو اننت ناگ، شوپیاں، بڈگام بارہ مولہ، کُوپ واڑہ تک انتہاپسندوں نے اپنا جال پھیلا دیا تھا۔ سرحد کے اس پار سے اسلحہ دھڑا دھڑ پہنچ رہا تھا۔ جوں جوں حکومت امن بحال کرنے کے لیے سخت قدم اٹھا رہی تھی توں توں انتہاپسندوں کی کارروائیاں بڑھتی جا رہی تھیں۔ تعلیمی ادارے بند تھے۔ ہر تیسرے دن ہڑتال ہو جاتی تھی۔ بازار کئی کئی روز بند رہتے تھے۔ کاروبار ایکدم ختم ہو گیا تھا۔ وادی کی ہندو آبادی اپنے گھر چھوڑ کر باہر جانے لگی تھی۔ اپنے بھرے پُرے گھر چھوڑ کر اور اپنی جانیں بچانے کے لیے ہندو آبادی جموں کی طرف بھاگنے لگی تھی۔ جن کے کہیں دوسری جگہ ٹھکانے تھے وہ وہاں جا رہے تھے۔ جموں میں، پنجاب میں، دہلی میں جہاں جہاں بھی کسی کو پناہ مل سکتی تھی وہ وہیں جا رہا تھا۔ حالات ایسی شکل اختیار کرتے جا رہے تھے کہ اب ہندو اقلیت اپنے آپ کو وادی میں محفوظ نہیں سمجھتی تھی۔ یہاں تک کہ سرکاری ملازم بھی سرینگر سے نکل رہے تھے۔ میڈیکل کالج کے طلبا بھی سرینگر سے جموں چلے آتے تھے اور چاہتے تھے کہ انھیں یا تو جموں کے میڈیکل کالجوں میں ایڈجسٹ کیا جاتے یا انھیں ہندوستان کے دوسرے میڈیکل کالجوں میں ایڈجسٹ کیا جاتے۔ قانونی اڑچنیں ایسی تھیں کہ ان کی کوئی بھی مانگ پُوری نہ ہو رہی تھی۔

مہاجر پُورے پُورے خاندان کے ساتھ جموں کے مختلف محلّوں میں ایک ایک کمرہ کرایے پر لے کر پڑے تھے۔ کوئی پُرسانِ حال نہیں تھا۔ مالک مکان زیادہ سے زیادہ کرایے لینا چاہتے تھے اور کم سے کم سہولتیں دینے پر راضی تھے۔ ان ہی دنوں انتہاپسندوں نے کشمیر یونیورسٹی کے وائس چانسلر اور ایچ ایم ٹی کے جنرل منیجر کو اغوا کر لیا تھا اور پھر تین

دنوں کے بعد انھیں مار ڈالا تھا۔ اخبار نویس یا ٹیلی ویژن کے جو لوگ سرینگر ہو کر آتے تھے ان کے انکشافات بڑے ہی دل دہلا دینے والے تھے۔ سرحد کے اس پار سے ٹریننگ حاصل کر کے وادی میں چوری چھپے واپس آئے نوجوان پکڑے جاتے تھے تو بڑے ہی سنسنی خیز بیان دیتے تھے۔ گورنمنٹ آف انڈیا پاکستان کو بار بار کہہ رہی تھی کہ وہ وادی میں دخل اندازی نہ کرے اور اسلحہ نہ بھیجے۔ سرکاری بیانوں اور وعدوں کے باوجود حالات میں کوئی سدھار نہ ہو رہا تھا۔

میں جموں میں آئے مہاجروں کی حالت اپنی آنکھوں سے دیکھنا چاہتا تھا۔ کیونکہ میں نے ان کی حالت اس زمانے میں بھی دیکھی تھی جب قبائلیوں کے حملے کے بعد وہ اپنے بستے رستے گھروں کو خیرباد کہہ کر جموں کے ریفیوجی کیمپوں میں آئے تھے۔ ان دنوں تو مہارانی تارا دیوی اور یُوراج کرن سنگھ نے بھی ریفیوجی کیمپوں میں جا کر لوگوں کی امداد کی تھی۔ لیکن اب تو سوچنے کا انداز ہی بدل گیا تھا۔ جموں کے لوگ اپنے ہی بھائیوں کو اپنی خوشی سے سہولتیں دینے کو تیار نہ تھے۔ وہ تو انھیں اپنے لیے ایک مصیبت خیال کرتے تھے۔ ان لوگوں کے آنے سے ان کا کاروبار خراب ہوگا۔ ان کی ملازمتوں پر اثر پڑے گا۔ اس نئی آبادی کے بڑھنے سے سو طرح کے مسئلے کھڑے ہوں گے۔ ایک قسم کا تناؤ پیدا ہو گیا تھا آپس میں۔

میں نے جموں میں آکر جب یہ حالات دیکھے تو مجھے بڑا دکھ ہوا۔ مہاجروں میں ایسے بزرگ مرد اور عورتیں مجھے ملیں جنہوں نے اپنی تمام زندگی سرینگر کے سات پُلوں سے ملحقہ تنگ گلیوں میں گزاری تھی۔ ان کی تمام کائنات ان سات پُلوں تک ہی محدود تھی۔ ان سات پُلوں کی پُرسکون دنیا کے علاوہ بھی کوئی اور دنیا تھی کہیں۔ اس کا انہیں بالکل اندازہ نہیں تھا۔ کیا کوئی ایسی دنیائیں بھی تھیں جن کے قاعدے قانون اور جینے کے انداز، ان کی دنیا سے مختلف تھے، وہی مسلمان پڑوسی جن کے خوف سے وہ اپنے چھوٹے چھوٹے لکڑی کے مکان چھوڑ کر بھاگ آئے تھے، برسوں ان کی زندگی کے ہر لمحے میں ان کے شریک رہے تھے۔ اُن کے بیٹوں اور بیٹیوں کی شادیاں ایک دوسرے کے مشورے سے طے ہوئی تھیں۔ اپنے رشتوں کو مضبوط کرنے کے لیے اُنھوں نے اپنے اپنے نام بھی ایک جیسے ہی رکھے تھے۔ ان مہاجروں میں بیشتر ایسے تھے جنھوں نے اِدھر بارہ مُولہ کے آگے اور اُدھر قاضی گنڈ کے آگے کچھ بھی نہیں دیکھا تھا۔ بے چارے بانہال کے جواہر ٹنل تک بھی نہیں آئے

تھے کبھی۔ انھیں یہ معلوم ہی نہیں تھا کہ دنیا کے کسی علاقے میں گرم ہوائیں بھی چلتی ہیں۔ لوگ ایرکنڈیشنرز لگاتے ہیں گرمیوں میں۔ اور رات کو کھلی چھتوں پر یا گھروں کے صحنوں میں سوتے ہیں اور پینے کے پانی پر بھی کنٹرول ہے کہیں۔ میں کچھ بزرگوں سے ملا تو انھوں نے کہا کہ وہ جموں کی گرمی برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ بزرگ عورتوں نے مجھے اپنے گورے چٹے بازو دکھائے جن پر سُرخ سُرخ دانوں نے چھوٹے چھوٹے زخموں کی شکل اختیار کر لی تھی۔ وہ چاہتے تھے کہ اپنے تنگ چھوٹے چھوٹے گھروں کو لوٹ جائیں اور وہیں زندگی کے آخری سانس لیں۔ نہ ان کے پاس گزارے کے لیے پیسے تھے۔ نہ ان کے پاس پہننے کو کپڑے تھے۔ ایکدم بھکاری بن گئے تھے بے چارے۔ ان کے جوان پڑھے لکھے بیٹے اور خوبصورت بیٹیاں دن بھر دفتروں میں ملازمتوں کے لیے دھکے کھا کر واپس آجاتے تھے۔ کوئی بھی ان کی مدد کرنے کو تیار نہ تھا کچھ لوگ تو ایسے بھی تھے جو انھیں جھوٹی تسلی بھی نہ دیتے تھے کہ ان کی ہمت بنی رہے۔ یہ نہیں کہ جموں میں امیر لوگ نہیں تھے کھاتے پیتے لوگ تو تھے لیکن اپنے اُجڑ کر آئے بھائیوں کی مدد کرنا نہ چاہتے تھے۔ سوائے دو چار انجمنوں کے کوئی بھی کچھ کرنے کو تیار نہ تھا۔ میں نے اپنے کچھ جاننے والوں کو اکٹھا کیا اور ان کی ایک ایسوسی ایشن بھی قائم کی۔ انھوں نے کچھ کام کرنا بھی شروع کیا۔ لیکن دُکھ درد کی اتنی بہتات تھی کہ چھوٹی موٹی کوششوں سے کچھ نہ بن پا رہا تھا۔ میں نے وہاں کے اخبار والوں سے بھی کونٹیکٹ کیا۔ کچھ دوست آگے آئے بھی' لیکن مجھے لگا کہ وہ سب میرے کہنے سے کچھ کرنے کو تیار ہوتے تھے۔ ان کی اپنی کمٹمینٹ نہیں تھی۔ مجھے واقعی بہت دھکا لگا۔ میرا وہاں رہنا فضول تھا۔ میں دہلی لوٹ آیا۔

دہلی آکر میں نے سب لیڈنگ پیپرز میں آرٹیکل لکھے جن لوگوں سے انٹرویو کیے تھے انھیں پریس میں دیا۔ دہلی میں رہنے والے کشمیری خاندانوں سے ملا۔ رشیل نے عورتوں کا ایک گروپ بنایا اور ان لوگوں نے گھر گھر جا کر اُن سے روپے' کپڑے' دوائیں' برتن' پنکھے حاصل کیے اور رشیل ایک ڈیلی گیشن لے کر جموں (کبھی گئی) اور مہاجروں کی مدد کے لیے سرکاری اور غیر سرکاری سطح پر جو کچھ ہو سکتا تھا کیا۔ مجھے اس بات کی بیحد خوشی ہوئی کہ سرفراز بھی اپنے کچھ دوستوں کو لے کر رشیل کے گروپ کی مدد کے لیے جموں پہنچ گیا تھا۔ ادھر میں دہلی میں پریس کے محاذ پر لڑنے لگا۔ اُدھر رشیل اور سرفراز کے گروپ انسانی قدروں کے محاذ پر ڈٹ گئے۔

اُدھر سرینگر میں حالات مزید بگڑتے گئے اور کشمیری عوام جنھیں سیاست سے کوئی

تعلق نہ تھا، اقتصادی بوجھ کے نیچے دبنے لگے۔ عوام کا دارومدار تو ٹورسٹ پر تھا۔ وہ گرمیوں کے چند مہینوں میں سارے سال کی کمائی حاصل کر لیتے تھے۔ لیکن اب تو ٹورسٹ نام کو نہیں تھا وادی میں۔ نہ کوئی ہاؤس بوٹ کرائے پر چڑھ رہا تھا نہ کوئی شکارا ٹورسٹ کو ڈل کی سیر کرا رہا تھا۔ نشاط اور شالیمار میں کھلے پھول بنا کسی کے دیکھے ہی مرجھا رہے تھے۔ چناروں کے سایے دن بھر پھیل کر رات کو خود ہی سمٹ جاتے تھے۔ ان کی چھاؤں میں تو اب کوئی بھی سستانے والا نہیں تھا۔ ڈل کے پانی میں ایک بھی لہر نہ اٹھتی تھی۔ ایک تالاب بن کر رہ گئی تھی یہ خوبصورت جھیل۔ چشمہ شاہی کا ٹھنڈا، زندگی بخش پانی بیکار بہہ بہہ کر برباد ہو رہا تھا۔ ایک چلّو پانی پینے والا بھی تو نہیں تھا کوئی یہاں۔ جب میں اخباروں کے لیے ایسی دلدوز باتیں لکھتا تو میری اپنی آنکھوں میں آنسو آ جاتے۔ اس اقتصادی بحران اور انسیکیورٹی سے نہ صرف ہندو طبقہ ہی متاثر ہوا بلکہ اب تو کئی مسلم خاندان بھی وادی کو چھوڑنے لگے تھے۔ آخر وہ کب تک اقتصادی کرائسیس کا مقابلہ کر سکتے تھے اور دن رات اپنے آپ کو غیر محفوظ سمجھ کر زندگی گزار سکتے تھے۔ مسلم خاندانوں کا وادی کو چھوڑنا تو ایک بہت ہی تشویشناک بات تھی۔

رشیل چاہتی تھی کہ وہ دو ایک دن کے لیے سرینگر جاتے اور ذون اور مبارک اور بختاں والی کو مل آتے۔ لیکن اس کے گروپ میں سے کسی نے اس کی اس تجویز سے اتفاق نہیں کیا۔ البتہ سرفراز دو دن کے لیے پریس کے کچھ لوگوں کے ساتھ سرینگر چلا گیا اور ذون اور مبارک اور بختاں والی سے مل آیا اور سرینگر کے حالات بھی اپنی آنکھوں سے دیکھ آیا۔ دلی واپس آ کر اس نے جو داستانیں سنائیں وہ بے حد دردناک تھیں۔ اس نے درد بھری آواز میں کہا۔

"پاپا، سرینگر تو اب اجڑ چکا ہے۔ کوئی بھی تو خوبصورت پہلو نہیں رہا وہاں۔ ہر طرف قتل اور مار دھاڑ اور اغوا کی باتیں ہوتی ہیں۔ کیا ہوگا ہماری خوبصورت وادی کا؟"

"جو خدا کو منظور رہے۔"

"وادی کے عام آدمی کی حالت تو بہت نازک ہوتی جا رہی ہے۔"

"عام آدمی کی حالت تو صدیوں سے ہی ایسی ہے۔ جو حالت تم دیکھ کر آئے ہو اس کے پیچھے تو صدیوں کا استحصال ہے بیٹا۔"

"وہ تو ٹھیک ہے لیکن اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ تم کسی آدمی پر زندگی کے دروازے ہی بند کر دو۔ بغیر کھلی ہوا اور دھوپ کے تو عام کشمیری مر جائے گا پاپا۔"

"وہ اب کون سا جی رہا ہے۔ بس موت اور زندگی کی سرحد پر پڑا سانس لے رہا ہے بیچارہ۔ للتا دیتہ کے دور سے، جسے کشمیر کا بڑا مشہور راجہ کہا جاتا ہے، ایسا ہی ہوتا آیا ہے۔ کلہن کے الفاظ میں "راج ترنگنی" میں آٹھویں صدی کے اس راجہ نے عوام کے بارے میں جو کہا ہے وہ سنو۔ میں نے اس کا ذکر ابھی حال ہی کے ایک آرٹیکل میں بھی کیا ہے۔

" Action should be taken repeatedly so that the people in the villages should not possess grain for consumption and bullocks for the area of the fields in excess of annual requirements." " For, if they were to have excessive wealth, they might become very terrible Damaras in a single year able to violate the authority of the king."[32] While the courtiers had " fried meats" and "delightful light wine cooled with ice and perfumed with flowers, "[33] the food of the common people was, as it still remains, rice and nakh(Samskrta Saka).[34]

"کیا یہ سچ ہے پاپا؟"

"یہ سچ صرف کتابوں میں لکھا ہوا سچ نہیں۔ اس زندگی کا سچ ہے جسے ہم بھوگ رہے ہیں۔ سرفراز جب میں تمہاری عمر میں تھا تو اس سے کہیں زیادہ تلخی تھی مجھ میں۔ عمر کے اس حصے میں پہنچ کر وہ تلخی طرح طرح کے تجربوں میں گھل کر کچھ ہلکی تو ضرور ہو گئی ہے لیکن ختم نہیں ہوئی۔ بس یہ ہوا ہے کہ اب وہ میری تحریروں میں پھیل گئی ہے۔"

"کیا آج کے کچھ مسلمان نوجوانوں کا یہ خیال کہ انھیں پاکستان کا حامی بن جانا چاہیئے، صحیح ہے؟"

"صحیح نہیں ہے۔ صدیوں کا استحصال بجائے آزاد ہونے کے عوام کو ایک بیرونی طاقت کا غلام بنا دے گا۔ عوام کی قسمت میں شاید آزادی سے جینا لکھا ہی نہیں ہے۔ روم کی تہذیب جس کا بڑا بول بالا ہے۔ اس میں بھی عام آدمی کا کام صرف بچے پیدا کر کے اپنی ریاست کی خدمت کرنا ہی تھا۔ اس وقت وادی کو کسی باشعور، باہمت اور بلند کردار رہنما کی ضرورت ہے۔ فوج تمہاری حفاظت کر سکتی ہے تمہیں زندگی کا فلسفہ اور کردار کی بلندی تو نہیں دے سکتی۔ ہم تو دوسرے ملکوں

سے بھی سبق حاصل نہیں کرتے ۔ دو حصوں میں بٹے رہنے کے اتنے سالوں بعد جرمنی تو دوبارہ ایک ہو جانے کا فیصلہ کر سکتا ہے ۔ کوریا بھی شاید کر لے ۔ ویت نام بھی شاید اسی طرح سوچنے لگے لیکن متحدہ ہندوستان کے لوگ اپنے ملک کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کرنے پر تُلے ہوتے ہیں ۔ دنیا بھر کو گیان کی روشنی دینے والا ملک خود تاریکی کی طرف جا رہا ہے ۔ او گاڈ ! چھوڑو اس قصے کو اب ۔ یہ بتاؤ ذُون کیسی ہے ؟"

"بے حد بیمار ہے ۔ انکل بہت پریشان ہیں ۔ ٹھیک طرح سے علاج بھی نہیں کروا سکتے بے چارے ۔ حالات ہی ٹھیک نہیں ہیں وہاں ۔ آپ چچا جان کو کہیے کہ وہ ذُون آنٹی کو علاج کے لئے دہلی لے آئیں ۔ بختاں والی کا بھی یہی خیال تھا ۔"

"آج ہی بات کرتا ہوں ٹیلی فون پر ۔ بختاں ٹھیک ہے ؟"

"جی پاپا ۔ آپ کو بہت یاد کرتی تھی ۔"

اس رات بہت کوشش کی کہ مبارک سے ٹیلی فون پر بات ہو جائے، لیکن لائن ملی ہی نہیں ۔ اگلے دن میں نے اسے ایک طویل خط لکھا اور اصرار کیا کہ ذُون کو علاج کے لیے دہلی لے آتے ۔ یہاں میڈیکل انسٹی چیوٹ میں داخل کروا کر اُس کا پورا علاج کروائیں گے ۔ سرینگر میں اس وقت میڈیکل سروسز بھی پوری طرح نہیں مل رہی تھیں ۔ اُسے فوراً یہاں آجانا چاہیئے ۔ کئی دنوں کے بعد مبارک کا جواب آیا ۔ ذُون کی حالت اب اس قابل بھی نہیں رہی تھی کہ اسے دہلی لے آیا جا سکے ۔ مبارک نے یہ التجا کی تھی کہ ہم سب ذُون کی زندگی کے لیے دعائیں کریں ۔ لگتا تھا ذُون ہمارے ہاتھوں سے نکلتی جا رہی تھی ۔ چند دن کے بعد بختاں والی کا خط آیا ۔ ذُون کے بار بار ضد کرنے پر وہ راج باغ سے زینہ کدل کے اپنے پرانے مکان میں آگئے تھے ۔ اس خبر نے مجھے ایکدم توڑ دیا تھا ۔ جیسے ذُون کو یہ یقین ہو گیا تھا کہ اب وہ زندہ نہیں رہے گی ۔ وہ اپنے اس گھر میں مرنا چاہتی تھی جس سے اس کی زندگی کی تمام تر وابستگیاں قائم تھیں ۔ وہ اپنے آخری سانس اپنے محل نما نئے مکان میں نہیں، بلکہ اپنی پرانی شکستہ جھونپڑی میں لے گی ۔ مجھے یقین ہو گیا کہ ذُون اب کچھ ہی دنوں کی مہمان تھی ۔

حقیقت یہ تھی، اور جسے میں بڑی سادگی اور معصومیت سے جھٹلا نے جا رہا تھا کہ میری اپنی صحت بھی بگڑتی جا رہی تھی ۔ ادھر شیل کے بلڈ پریشر اور ذیابیطس نے اُسے پریشان کر رکھا

تھا۔ کوئی ہفتہ ایسا نہیں ہوتا تھا، جب سرفراز اسے چیک اپ کے لیے میڈیکل انسٹی ٹیوٹ نہ لے جاتا ہو۔ البتہ میں ڈھیٹوں کی طرح ہر محاذ پر بنا انجام کے بارے میں سوچے لڑے جا رہا تھا۔
مبارک کا تار آیا تھا۔ ذُون کی حالت زیادہ خراب ہو گئی تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ رشیل اور میں ایک بار اسے دیکھ جائیں۔ میں نے جانے کا فیصلہ کر لیا لیکن رشیل کو مشورہ دیا کہ وہ میرے ساتھ نہ چلے۔

"تم مجھے سرینگر جانے سے نہ روکو۔"

"تمہاری طبیعت ابھی اچھی نہیں اور وہاں کے حالات بھی خراب ہیں۔ نہ جاؤ تو اچھا ہے۔"

"طبیعت تو تمہاری بھی خراب ہے۔"

"تمہاری زیادہ خراب ہے۔"

"دیکھو، ذُون سے ملنے کا یہ آخری موقع ہے۔ اگر میں اسے مل نہ سکی تو مجھے زندگی بھر افسوس رہے گا۔"

میں نے ضد نہیں کی، اپنی ہار مان لی۔ لیکن سرفراز نے اپنی ماں کو روکنے کی بھی ضد کی۔ ماں بیٹے میں اس بات پر گرما گرمی بھی ہوئی آخر سرفراز بھی ہار گیا اور پھر ہوائی جہاز سے ہمارے جانے کا بندوبست کرنے لگا۔ اس کی باتوں سے مجھے لگا کہ وہ بھی سرینگر جانا چاہتا تھا۔ رشیل نے تو جان بوجھ کر اُس طرف دھیان نہ دیا لیکن میں نے اُس کے دل کی بات جانتے ہوئے کہا۔

"ہم واپس آ جائیں تو تم بھی سرینگر ہو آنا۔"

"اور اگر تب تک ذُون آنٹی ——— ؟"

"ایسا مت سوچو۔ وہ ابھی ہمیں چھوڑ کر نہیں جائے گی۔"

"آنٹی چلی جائے گی پاپا۔"

"ہم اُسے اتنے لمبے سفر پر جانے سے روک کر آئیں گے۔" میں نے سرفراز کا کندھا تھپتھپایا اور اس کی آنکھیں چھلک پڑیں۔

"میرا اسلام کہہ دینا آنٹی کو۔" اس نے روکھے لہجے میں کہا۔

"ضرور کہوں گا۔ یقین رکھو۔" میری اپنی آواز بھی رُندھ گئی تھی اور آنکھیں بھی نم ہو گئی تھیں۔
اگلے دن بعد دوپہر رشیل اور میں سرینگر پہنچ گئے۔ مبارک ایئر پورٹ پر موجود تھا۔ وہ ہمیں راج باغ والے مکان میں لے گیا۔ ہمارے قیام کا انتظام وہیں کیا تھا اُس نے۔ زینہ کدل والے

مکان میں ہمیں دِقّت پیش آتے گی۔

شام کو زینہ کدل پہو۔ نچنے میں پریشانی کا سامنا کرنا پڑا۔ اس علاقے میں کرفیو لگا تھا ہر گلی کے موڑ پر فوج کے سپاہی موجود تھے۔ مبارک نے ہم دونوں کا پرمٹ تو بنوا لیا تھا لیکن پھر بھی ہمیں قدم قدم پر روکا جا رہا تھا۔ پرائیویٹ گاڑیوں کا اس طرف جانا تو روک دیا گیا تھا۔ ہم دھیرے دھیرے چل رہے تھے۔ مجھے لگا رشیل تھکنے لگی تھی۔ میں جب پوچھتا تو وہ مسکرا کر ٹال دیتی۔ زینہ کدل پہنچنے تک ہم راستے میں دو تین بار رُکے۔ رشیل سے واقعی نہیں چلا جا رہا تھا۔

"آپ نہ آتیں تو ٹھیک رہتا۔ بہت پریشانی ہو رہی ہے آپ کو۔" مبارک نے آخر کہہ ہی دیا رشیل کو۔

"تم تو معاف کر دیتے لیکن ڈُون مجھے کبھی معاف نہیں کرتی۔"

"اب اس کے پاس وقت ہی کتنا رہ گیا ہے کسی کو معاف نہ کرنے کا۔"

"رشیل کو آنا ہی چاہیئے تھا مبارک۔"

"میں جانتا ہوں چچا جان۔"

ہم دونوں رشیل کو سہارا دیتے ہوتے ڈُون کے زینہ کدل والے پرانے مکان میں پہنچ ہی گئے۔ مبارک رشیل کو سنبھالتے ہوتے اسے مکان کی دوسری منزل میں لے آیا۔ تختوں کے فرش پر، گدوں سے بنے بستر پر، تکیوں کے سہارے ڈُون آنکھیں بند کیے پڑی تھی۔ اس پر فالج کا حملہ ہو چکا تھا اور اب وہ بول بھی نہیں سکتی تھی۔ اور نہ ہی اپنے بازو ہلا سکتی تھی۔ ہوش بھی اسے کچھ زیادہ نہیں تھا۔ کچھ دیر کے بعد رشیل کے آواز دینے پر وہ اسے ٹکر ٹکر دیکھتی رہی اور پھر اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ رشیل اُس کے پاس ہی بستر کے قریب بیٹھ گئی اور اُس نے بختاں والی کو اپنی باہوں کے گھیرے میں لے لیا۔ بختاں والی ایک دم پھوٹ پڑی۔ چند ہی لمحوں میں ڈُون نے آنکھیں بند کر لیں، شاید وہ اسی لمحہ کا انتظار کر رہی تھی۔ رشیل رات کو وہیں رُک گئی اور مجھے مبارک راج باغ والے مکان میں چھوڑ گیا۔ جہاں اس نے اپنے دو ملازم ہماری دیکھ بھال کو چھوڑ رکھے تھے۔

اسی رات کے پچھلے پہر ڈُون کا انتقال ہو گیا۔

اگلی صبح ہی مبارک نے مجھے اطلاع بھجوائی اور میں فوراً ہی اس کے آدمی کے ساتھ زینہ کدل آ گیا۔

اس دن جمعہ تھا۔

پچھلی شام ہی انتہا پسندوں نے بازار بند کر دینے کا اعلان کر دیا تھا۔ کہیں کوئی دکان کھلی نہ تھی۔

آج جمعہ کی نماز پڑھنے کے لیے نوجوان سیکڑوں کی تعداد میں شہر کی مختلف مسجدوں میں جمع ہونے والے تھے۔ فوج نے سات پُلوں کی پرانی آبادی میں اپنی گشت اور بھی تیز کر دی تھی۔ سارے شہر میں کرفیو نافذ تھا۔ کسی کو اپنے گھر سے باہر نکلنے کی اجازت نہ تھی۔ ذُون کی لاش کو قبرستان تک لے جانا مشکل ہو رہا تھا۔ مبارک بے چارہ فوجی افسروں سے ذُون کے جنازے کو قبرستان تک لے جانے کا اجازت نامہ حاصل کرنے کے لیے ایک گلی سے دوسری گلی میں گھوم رہا تھا۔ کوئی شنوائی نہ ہو رہی تھی۔ افسر گلیوں میں تھوڑی موجود تھے۔ وہ تو اپنے اپنے عارضی قسم کے مرکزی ہیڈ کوارٹروں میں حالات پر نظر رکھنے کے لیے تعینات تھے۔ اجازت نامہ لے کر جب دوپہر کے قریب مبارک واپس آیا تو اس کے ساتھ دو شرطیں تھیں، ایک تو یہ کہ جنازہ نہیں اُٹھے گا۔ لاش کو ٹرک میں رکھ کر قبرستان میں لے جایا جائے گا جس کے ساتھ صرف چار آدمی ہوں گے، جن میں کوئی عورت نہ ہوگی، دوسری شرط یہ تھی کہ لاش جمعے کی نماز ختم ہونے کے بعد گھر سے باہر جائے گی، جب لوگ اپنے اپنے ٹھکانوں پر چلے جائیں گے۔ میں نے مبارک کے ہاتھ سے لے کر اجازت نامہ پڑھا تو میں ایکدم چیخ اٹھا۔ یہ لوگ تو مُردوں کی بھی بے حُرمتی کر رہے تھے۔

"یہی دن دیکھنے کو زندہ ہیں ہم لوگ، مبارک۔"

"کتنا بڑا ظلم ہے۔"

"یہاں تو مرنا بھی آسان نہیں اب۔" رشیل نے بڑے غمناک لہجہ میں کہا۔

"میرا کیا ہوگا، چچا جان؟" بختاں والی میرے ساتھ چمٹ گئی۔

"اللہ والی ہے بیٹی۔" میں نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

اور پھر رشیل نے محلے کی عورتوں کے ساتھ مل کر ذُون کی لاش کو غسل کرایا اور اسے کپڑے پہنائے اور جب لاش کو دفنانے کے لیے تیار کر کے نیچے کے بڑے کمرے میں رکھا گیا تو کہرام مچ گیا۔ لگتا تھا قیامت آگئی تھی۔ عورتیں اس طرح رو رہی تھیں جیسے وہ اپنی آنکھوں کے تمام آنسو آج ہی ختم کر ڈالیں گی۔ محلّے کے مرد ایک ایک کر کے گھر میں جمع ہو گئے تھے اور خاموشی سے بیٹھے ہوتے تھے۔ بس یہ سب یہیں رہ جائیں گے۔ جب ذُون کی لاش کو

فوجی ٹرک میں رکھا جائے گا تو ان میں سے کوئی بھی قبرستان تک نہیں جائے گا، حالانکہ قبرستان کوئی بہت دُور بھی نہیں تھا۔ سہ پہر کا وقت تھا۔ فوجی ٹرک مبارک کے گھر کے سامنے کھڑا ہو گیا تھا۔ مبارک نے، میں نے اور محلے کے دو اور لوگوں نے، دفنائے جانے کے لیے، ڈُون کے مردہ جسم کو ٹرک میں رکھ دیا۔ ہم چاروں ٹرک میں بیٹھ گئے۔ محلے کی عورتیں ایک بار زور سے چیخیں اور پھر گلی میں ڈیوٹی پر تعینات فوجی سپاہیوں نے گرج کر کہا کہ اگر انھیں اسی طرح رونا ہے تو گھر کے اندر جا کر روئیں۔ میں غصّے میں کچھ کہنے والا تھا کہ مبارک نے روک دیا۔ یہ تو روز کا قصّہ بن چکا تھا وہاں۔ اور پھر ڈُون کو مٹی کے سپرد کر کے اور اس کی قبر پر مُٹھی بھر مٹی ڈال کر ہم گھر لوٹ آئے۔ اس وقت سورج غروب ہونے والا تھا۔ تیس سال کے بعد یہ پہلی رات تھی جو مبارک اپنے گھر میں ڈُون کے بغیر گزار رہا تھا۔ شیل اور میں بھی وہیں تھے۔ مبارک، بختاں والی، شیل اور میں رات بھر جاگتے رہے اور ڈُون ہی کی باتیں کرتے رہے تھے۔

اگلے دن مبارک اور بختاں والی اور شیل اور میں راج باغ والے مکان میں آ گئے۔ بختاں والی تو تمام دن شیل کے ساتھ جُڑ کر بیٹھی رہی۔ مجھے لگا کہ وہ ماں کے بغیر نہیں رہ سکے گی۔ لیکن اس کی ماں کو کون واپس لا سکتا تھا، اُس دنیا سے جس میں اب وہ آباد ہو گئی تھی۔ مجھے لگا کہ مبارک بھی ایکدم ٹوٹ گیا تھا۔ شام کو مبارک اور بختاں والی کچھ دیر کے لیے اپنے زینہ کدل والے مکان میں گئے تھے۔ کچھ چیزوں کو ٹھکانے لگانے اور مکان میں تالا ڈالنے کے لیے۔ وہ کرفیو نافذ ہونے سے پہلے لوٹ آنے کو کہہ گئے تھے۔

شیل تو ایکدم ٹوٹ گئی تھی۔

اُسے ڈایزاپام کا انجکشن لگ جاتا تو مناسب تھا۔ مبارک کے ساتھ والی کوٹھی شاید ڈاکٹر ہی کی تھی۔ باہر نیم پلیٹ پر ڈاکٹر رفیق احمد لکھا تھا۔ میں فوراً ہی گیٹ کھول کر کوٹھی کے اندر داخل ہو گیا۔ سامنے ڈاکٹر رفیق ہی کھڑا تھا۔

"السلام علیکم۔"

"وعلیکم السلام۔" میں نے جواب دیا۔

"آپ مبارک صاحب کے مہمان ہیں۔"

"جی۔"

"ان کی بیوی، خدا کی نیک بندی تھی۔ اس کے دنیا سے اٹھ جانے کا بڑا افسوس ہے۔"

"خدا اس کی رُوح کو سکون دے۔"

"آپ کیسے آئے ہیں؟"

"جی میری بیوی بلڈ پریشر اور ذیابیطس کی مریض ہے، پچھلے دو دن کی ٹینشن سے وہ بے حد تھک گئی ہے اگر زحمت نہ ہو تو اسے دیکھ لیجئے۔"

"زحمت کی کیا بات ہے اس میں۔ چلئے۔"

ڈاکٹر رفیق فوراً اپنا بیگ لے کر میرے ساتھ ہو لیا۔ شیل بستر پر پڑی تھی اور بے حد تھکی ہوئی لگتی تھی۔ ڈاکٹر رفیق نے اس کا اچھی طرح سے معائنہ کیا۔ فوراً ہی ڈایزاپام کا انجکشن لگایا۔ کچھ ٹیبلیٹس دیں اور ضروری ہدایتیں دے کر چلا گیا۔ جاتے ہی اس نے اپنے نوکر کے ہاتھ گرم گرم چائے کی ٹرے اور کھانے کو نمکین بسکٹ بھجوائے۔ لگتا تھا شیل کو اس وقت چائے کی بے حد ضرورت تھی۔ میں نے جب گرم گرم چائے کی پیالی اس کے ہاتھ میں تھمائی تو اس نے دھیرے سے مسکرا کر شکریہ ادا کیا۔ اس تکلف کا مطلب یہ تھا کہ اسے اس وقت چائے پلا کر میں نے اس پر بہت بڑا احسان کیا تھا۔ حالانکہ چائے میں نے نہیں بنائی تھی۔ ڈاکٹر رفیق نے بھجوائی تھی۔ لیکن کبھی کبھی کسی اپنے کا بھی احسان ماننا اچھا لگتا ہے۔ بہت ہی اچھا۔

"بے حد تھک گئی ہوں۔ سونا چاہتی ہوں۔"

"تو سو جاؤ نا۔"

"تمہیں تو کوئی اعتراض نہیں۔"

"وٹ آر یُو ٹاکنگ ڈارلنگ۔"

میں نے اپنے بازوؤں میں سنبھال کر شیل کو بستر پر لٹا دیا اور اس کے پاؤں پر شال ڈال دیا۔ میں سامنے کرسی پر بیٹھا رہا اور چائے پیتا رہا۔ تھوڑی ہی دیر میں شیل سو گئی۔

میں اُٹھ کر کمرے کی کھلی کھڑکی کے ساتھ لگ کر کھڑا ہو گیا۔ میرے سامنے جہلم کا سست رفتار دریا تھا۔ سفیدے کے اونچے اونچے درخت تھے اور بند پر اُگے گھنی چھاؤں والے بہت ہی پُرانے چنار کے پیڑ تھے اور اُدھر شنکر آچاریہ کی پہاڑی تھی جس کی دوسری طرف مہاراجہ ہری سنگھ کا محل تھا جو ایک فائیو اسٹار ہوٹل میں تبدیل ہو گیا تھا اور اس کے نیچے ڈل جھیل تھی۔ جس کے دائیں کناروں سے ذرا ہٹ کر نشاط اور شالیمار باغ تھے اور بائیں کنارے پر نسیم باغ تھا، جس میں کشمیر یونیورسٹی تھی اور تھوڑی ہی دُور پر حضرت بل کی

بہت ہی قدیم زیارت گاہ تھی، جہاں بہت برس پہلے مُوئے مبارک کے گم ہو جانے پر بہت بڑا سیاسی دھماکہ ہوا تھا۔

مبارک کی بہت ہی عالیشان کوٹھی کی دوسری منزل پر کھُلتی ہوئی کھڑکیوں میں سے ایک کھڑکی کے سامنے کھڑا میں اپنی زندگی کے لگ بھگ چالیس برس کے سفر کا جائزہ لے رہا تھا۔ ایک ہی جیسا تھکا دینے والا سفر طے کیا تھا میں نے میرے سفر میں بہت زیادہ موڑ تو نہیں تھے لیکن راستہ بڑا طویل اور تھکا دینے والا تھا۔ کھڑکی کے سامنے کھڑا میں اسی بے حد لمبے راستے کو نہار رہا تھا۔

اچانک میری سوچ کا عمل بہت تیز ہو گیا۔

زندگی کا اتنا طویل سفر کر کے آخر میں کہاں پہنچا تھا؟ میری اُپلبھدیاں کیا تھیں؟ کچھ بھی تو نہیں تھیں کہیں بھی تو نہیں پہنچا تھا میں۔ کہیں نہ پہونچنا بھی کوئی منزل تھی کیا؟

کیا کشمیر کا ایک عام آدمی جو لگ بھگ پندرہ صدیوں تک ـــــ مختلف نسلوں اور قوموں سے تعلق رکھنے والے اپنے بادشاہوں کا وفادار رہا تھا، اچھی سلوک کا مستحق تھا جو اُس کے ساتھ اب ہو رہا تھا؟ اگر اشوک مہان، راجہ پرورسین، للتادتیہ اور سلطان زین العابدین آ کر اپنی امن پسند اور محبوب رعایا کو دیکھیں تو ان کے دلوں پر کیا بیتے گی جس کشمیر کی تعمیر اور تہذیب کو سنوارنے اور نکھارنے میں انھوں نے اپنا خون پسینہ ایک کیا تھا؟ کیا یہ وہی کشمیر تھا جس کے بارے میں کلہن پنڈت نے "راج ترنگنی" میں لکھا تھا ـــ

> Such is Kasmir, the country which may be conquered by the force of spiritual merit but not by armed force; where the inhabitants in consequence fear more the next world; where there are not baths in winter, comfortable landing places on the river-bamks, where the rivers being free from aquatic animals are without peril; where, realizing that the land created by his father is unable to bear heat, the hot-rayed sun honours it by bearing himself with softness

even in summer. Learning, high
dwelling houses, saffron, iced water,
grapes and the like- what is commonplace
there, is difficult to secure in paradise.

(First Taranga-39-42)

بہت برس پہلے میں نے "راج ترنگنی" پڑھی تھی اور کلہن پنڈت کے طرز تحریر سے بہت متاثر ہوا تھا۔ کشمیر کے پرانے اتہاس کو جاننے کے لیے اس سے بہتر کوئی بھی اور کتاب نہیں۔ مورخوں نے کشمیر کے بارے میں جو کچھ بھی لکھا اس کے تمام حوالے "راج ترنگنی" ہی سے لیے۔ جب سے وادی کے حالات بگڑنے شروع ہوتے تھے میں نے "راج ترنگنی" کو پھر سے پڑھنا شروع کیا ہے۔ اس سے مجھے بڑی تسکین ملتی ہے۔ میں ایک عجیب سی بات سوچنے لگا ہوں۔ مجھے لگنے لگا ہے کہ میں بھی ان گنت راجاؤں کی گہری، طویل اور صدیوں پر محیط اس پرسکون ندی کی کسی لہر کا ایک معمولی سا حصہ ہوں، جو ندی اپنی آغوش میں پچھلے دو ہزار سالوں میں کیسے کیسے عظیم حکمرانوں کے کارناموں اور ان کی تاریخ کے سنہری اوراق کو اپنے سینے سے لگاتے مسلسل بہتی چلی جا رہی ہے اور اب تک بھی اس کی روانی کو تھکن اور انحطاط کا احساس نہیں۔

اگر وِتستا ندی اتنی صدیوں کے طویل سفر سے نہیں تھکی اور اب بھی پہلے کی ہی طرح رواں ہے، تو مجھے بھی تھکن کا احساس نہیں ہونا چاہیئے۔ میں بھی تو اس عظیم دریا کا ایک حصہ ہوں جسے زندگی کہتے ہیں اور جس کے بہاؤ میں کبھی سستی اور تھکان نہیں آتی، تو پھر میں کیوں اضمحلال اور تھکاوٹ کا احساس کروں؟ مجھے ابھی اور آگے جانا ہے اور کشمیری عوام کو اپنے ساتھ رکھنا ہے، جن کی زندگی میں ایک عارضی سی تھکن آگئی ہے۔ وہ اتنی صدیوں تک چلتے رہنے کے بعد ایک جگہ پر آکر رک گئے ہیں اور تذبذب اور وسوسوں کے بھنور انھیں گھیرنے لگے ہیں۔ میں نویں صدی کے کشمیر کے راجہ اونتی ورمن کے عہد کا مشہور انجینیر سوتیا ہوں، جس نے جہلم دریا کے پانی کو ایک سمت دی تھی اور ایک متوازن بہاؤ دیا تھا اور اسے اپنی رفتار اور اہمیت کا احساس دلایا تھا۔ میں روشنی اور روانی کا امانت دار ہوں۔ تاریکی اور تھکن کا نمائندہ نہیں ہوں۔ مجھے اپنا سفر جاری رکھنا ہے۔ رکنا نہیں ہے مجھے۔ میں رک گیا تو آکاش کے نیلے گہرے ساگر میں تیرتا ہوا چاند بھی رک جائے گا۔ اس آدھے چاند کو ابھی پورا چاند بننا ہے اور اپنی چاندنی سے تمام

وادی کو شرابور کر دیتا ہے کہ وہ ایک بار پھر نکھر جاتے اور سنور جاتے اور پام پور کے زعفران زاروں کی خوشبو سے مہک اٹھے۔ میں کھڑکی سے ہٹ گیا ہوں۔

سشیل نے اپنی کمزور آواز میں روشنی جلا دینے کو کہا ہے۔ میں اس کے بستر پر بیٹھ گیا ہوں اور اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا ہے۔ اب وہ پہلے سے بہتر لگ رہی ہے۔ کرفیو دوبارہ لگ چکا ہے۔ شہر کے اس حصے میں ڈھیل ہے چونکہ یہ باہر کا علاقہ ہے۔ اسی لمحہ مبارک اور بختاں والی بھی سیڑھیاں چڑھ کر اوپر آتے ہیں۔ وہ زینہ کدل والے مکان میں تالا ڈال آتے ہیں۔ اب کئی روز تک وہ اُدھر نہیں جائیں گے۔ ڈون کے چالیسویں پر ہی جائیں گے اُدھر۔ باپ بیٹی دونوں بہت تھکے ہوتے ہیں۔ لگتا ہے زندگی پر ان کی گرفت بھی کچھ ڈھیلی پڑ گئی ہے۔ شدید ذہنی اور جسمانی تناؤ سے بھی تو گزر رہے ہیں وہ ان دنوں۔ میں نے انھیں مشورہ دیا ہے کہ وہ اپنے اپنے کمروں میں جاکر کچھ دیر آرام کر لیں۔ جب ملازم کھانا تیار کر لے گا تو میں انھیں بتا دوں گا۔

مبارک اور بختاں والی دونوں چلے گئے ہیں۔ مبارک تھوڑی دیر کے بعد پھر ہمارے کمرے میں لوٹ آیا ہے۔

چچا جان میں آپ ہی کے پاس بیٹھوں گا کچھ دیر۔"

"بیٹھو نا مبارک۔"

"لگتا ہے یہ وادی اب اپنی روایات کی حفاظت نہیں کر سکے گی۔"

"یہ عارضی اتھل پتھل ہے۔ سب ٹھیک ہو جاتے گا۔"

"جن قدروں کے لیے آپ اور آپ کے ساتھی اتنا عرصہ لڑتے رہے ہیں، وہ قدریں اب مجروح ہو چکی ہیں۔ لگتا ہے کسی بھی لمحہ دم توڑ دیں گی۔"

"ایسا نہ سوچو مبارک۔"

"ٹھیک کہہ رہا ہوں۔ میں سوچتا ہوں کہ اپنا کاروبار دہلی منتقل کر لوں۔"

"وادی سے اپنا رشتہ توڑنا چاہتے ہو؟"

"یہ رشتہ تو کبھی نہیں ٹوٹے گا۔ اس رشتے میں ایک دوسرا رشتہ جوڑنا چاہتا ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ سرفراز میرے کاروبار میں پارٹنر بن جاتے اور دہلی کا کاروبار سنبھال لے۔"

"مجھے اس میں کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ میں سرفراز سے بھی بات کر لوں گا۔"

"اس سے بختاں والی بات کر چکی ہے۔ اسے یہ تجویز منظور ہے۔"

"تو تم ہاں کیوں نہیں کہتے۔ ٹال مٹول کیوں کر رہے ہو" رشیل تکیوں کا سہارا لے کر اٹھی اور ہماری گفتگو میں شامل ہو گئی۔

"رشیل مجھے ہر وقت ڈانٹتی رہتی ہے" مبارک ۔"

"ان کا حق ہے چچا جان۔"

"کوئی اور بھی طرفدار چاہیئے تمہیں؟" رشیل بولی۔

"نہیں بھاگوان۔ تمہارے خلاف تو کسی کو بھی بولنے کی جرأت نہیں ہو سکتی۔"

ہم تینوں ہنس دیے۔ لیکن یہ ہنسی اتنی زور کی نہیں تھی کہ ہمارے ذہنوں پر چھایا ہوا بوجھ کم ہو جاتا۔ وہ تو بدستور قائم تھا۔

ابھی ہم کھانے سے فارغ ہوتے ہی تھے کہ پڑوس کا ڈاکٹر رفیق احمد دوبارہ آیا۔ اس نے رشیل کو پھر دیکھا اور پہلے والی دوائیاں ہی جاری رکھنے کو کہا۔ اس نے ایک آدھ ٹیبلیٹ مبارک کو بھی دی اور نیند آور آدھی گولی بختاں والی کو بھی دیدی۔ ان دونوں کو گہری نیند کی ضرورت تھی۔ پھر ڈاکٹر رفیق چلا گیا۔ مبارک اور بختاں والی دونوں اپنے اپنے کمرے میں چلے گئے۔ جانے سے پہلے بختاں والی نے رشیل کو خدا حافظ کہا اور اس نے بختاں والی کا ماتھا چوم لیا۔

پھر رشیل اور میں دونوں سو گئے۔

پچھلے پہر اچانک میری آنکھ کھل گئی۔

آدھے چاند کی روشنی سفیدے کے درختوں کے پیچھے سے چھن کر کھلی کھڑکی سے کمرے میں داخل ہو رہی تھی۔ جانے کیوں مجھے برسوں پہلے آسمان میں تیرتا ہوا وہ چاند یاد آگیا جو اپنی خاموش چاندنی لے کر دریائے جہلم کے کنارے لگے رمضان جُو کے ہاؤس بوٹ کی کھڑکی سے دبے پاؤں اندر آگیا تھا۔ وہ رات سرینگر میں میری اور رشیل کی پہلی رات تھی جب ہم لکھنؤ سے بھاگ کر یہاں آئے تھے اپنا ہنی مون منانے۔ اور ہمارے پاس چندے کی وہ رقم تھی جو گندوترا، سبھاشنی اور کئی دوسرے ساتھیوں نے اکٹھی کر کے مجھے دی تھی اور کہا تھا کہ ہم پراتے مال پر کچھ دن عیش کریں۔

وہ شاید رشیل کے اور میرے مشترکہ سفر کا پہلا سنگ میل تھا۔ اب تو ان گنت سنگ میلوں

سے گزر کر ہم یہاں پہنچے ہیں اور ایک دوسرے کو نہارتے ہوتے خاموش کھڑے ہیں۔
میں اپنے بستر سے خاموشی سے اُٹھ کر ایک بار پھر کھڑکی کے سامنے کھڑا ہو گیا ہوں۔
میں نے ایک بار پُونا میں بھگوان رجنیش کے آشرم میں اُس کا صبح سویرے والا سیشن اٹینڈ کیا تھا۔ اُس نے کہا تھا۔ زندگی کے بہاؤ کو روکنے کی کوشش نہ کرو۔ اسے بہنے جانے دو۔ زندگی کو رُکنا کسی بھی حالت میں پسند نہیں۔ اِس لحہ مجھے یہ الفاظ بھی یاد آرہے ہیں۔ اِس لمحہ مجھے بھگوان کرشن کا اُپدیش بھی یاد آرہا ہے جو اُس نے کورُکشیتر کی رن بھومی میں دیا تھا۔
۔تم کرم کرتے رہو، پھل کی اِچھا مت کرو، پھل تمہارے ہاتھ میں نہیں ہے۔ جانے کیوں اس وقت مجھے کرائیسٹ، بدھ، حضرت محمدؐ، گورونانک، مہاتما گاندھی، سبھی پیغمبروں اور عظیم آدمیوں کے قول یاد آرہے ہیں، جنھیں میں نے کبھی یاد کرنے کی کوشش نہیں کی۔ یہ سب زندگی کی عظمت اور اس کے لافانی ہونے کے گواہ ہیں۔ لافانی چیز کو فانی بنانے کی کوشش کرنا تو پاپ ہوگا۔ بس یہی سوچ میرے دماغ پر چھا گئی۔
پھر میں نے دیکھا آسمان میں صبح کا تارہ اپنی پوری تابانی سے چمکنے لگا تھا۔ میں کھڑکی سے پلٹ کر سشیل کے سرہانے کھڑا ہو گیا ہوں۔ سشیل گہری نیند سو رہی ہے اور میں اسے زیرلب مخاطب کر رہا ہوں ـــــ
سشیل، اٹھو میری جان۔ تم نے تو زندگی بھر میرا ساتھ دیا ہے۔ اب کیوں ہمت ہار رہی ہو؟
پو پھٹنے والی ہے۔ شنکر آچاریہ کی پہاڑی کے پیچھے سے سورج طلوع ہونے ہی والا ہے۔ آؤ ہم اس کمرے سے باہر نکل کر طلوع ہوتے ہوتے سورج کی پہلی سونا بکھیرتی ہوئی کرنوں کی روشنی سے شرابور ہو جائیں۔ آؤ ہم ڈون کے اس عالیشان مکان کی سب سے اوپر والی منزل پر کھڑے ہو کر اپنے ہم وطنوں کو مخاطب کریں اور انھیں یاد دلائیں کہ وہ اس وادی کے روشن ماضی کی شاندار روایات کے پاسدار ہیں، وہ ان روایات کو مجروح نہ ہونے دیں۔ انہیں کے بطن سے تو اُس مستقبل کی کرنیں جنم لیں گی جس کے خواب کشمیری عوام صدیوں سے دیکھتے آتے ہیں اور اب ان خوابوں کے بوجھ سے اُن کی پلکیں بھی بھاری ہونے لگی ہیں۔

رشیل، آؤ ہم اپنا روشن ماضی اور اس کی روایات سرفراز اور بختاں والی کو سونپ دیں کہ اب ہم اس قیمتی امانت کو زیادہ دیر تک نہیں سنبھال سکتے۔ اب ہم تھک چکے ہیں۔ ایسا نہ ہو کہ یہ امانت ہمارے کمزور ہاتھوں سے نکل جائے۔ نئے خواب تو نئی نسل کی ہی امانت ہوتے ہیں۔ تاریخ نے ہر دور میں، اس حقیقت کو بار بار دوہرایا ہے۔ وہ اب بھی بلند آواز میں اسی حقیقت کو دوہرا رہی ہے رشیل آؤ، تم بھی میرے قریب کھڑی ہو کر تاریخ کی اس آواز کو سنو!

مطبوعات ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی

شاعری

کتاب	مصنف	قیمت
نسخہ ہائے وفا (کلیات)	فیض احمد فیض	۷۵/-
مہر دو نیم	افتخار عارف	۶۰/-
شوخیٔ تحریر (مزاحیہ کلام)	سید محمد جعفری	۷۵/-
غبار ناتواں	مظفر شکوہ	۳۰/-
شاخِ منظر	جمشید مسرور	زیر طبع
مشعلِ جاں	مجروح سلطانپوری	۸۰/-
سمن زار (منتخب فارسی اشعار مع اردو ترجمہ)	ضیاء احمد بدایونی	۱۰/-
صلاح الدین پرویز کے خطوط	صلاح الدین پرویز	۶۰/-
کنفیشن	"	۶۰/-
سبھی رنگ کے ساون (۱۹۶۷ سے ۱۹۸۰ تک تخلیقات کا مجموعہ)	صلاح الدین پرویز	۱۲۵/-
تازہ ہوا	باقر نقوی (انگلینڈ)	۵۰/-
غالب کی رہگذر (غالب کی زمینوں میں غزلیں)	واجد سحری	۳۵/-
سنہری آنچ	"	۳۰/-
جادۂ شوق	باوا کرشن گوپال	۶۰/-
دلِ خاک بسر	شفق سوپوری	۵۰/-
صراطِ منزل	سید عاشور کاظمی	۶۰/-
آبِ نیساں	فرید پربتی	۱۵۰/-

AN ANTHOLOGY OF
MODERN URDU POETRY
BY BAIDAR BAKHT & KATHLEEN GRANT JAEGER
PRICE RS. 75/-

SELECTED POEMS OF BALRAJ KOMAL
BY LESLIE LAVIGNE & BAIDAR BAKHT
PRICE RS. 40/-

سفرنامہ

کتاب	مصنف	قیمت
سفر آشنا	گوپی چند نارنگ	۱۵/-
سرسید احمد خاں پنجاب میں	اقبال علی	۱۲۵/-

ناول و افسانے

کتاب	مصنف	قیمت
آگ کا دریا	قرۃ العین حیدر	۱۵۰/-
گردشِ رنگِ چمن	"	۱۶۵/-
چاندنی بیگم	"	۱۲۵/-
البم (یادیں)	ہرچرن چاولہ	۷۵/-
آتے جاتے موسموں کا سچ	"	۶۰/-
ناروے کے بہترین افسانے	"	۶۰/-
بازگوئی	سریندر پرکاش	۷۵/-
پہلی نسل کا گناہ	صفیہ صدیقی	۷۵/-
آئیڈینٹٹی کارڈ	صلاح الدین پرویز	۸۰/-
وہی قتل بھی کرے ہے	حیدر مہدی رضوی	۷۵/-
میرا شہر ادھورا سا	کشمیری لال ذاکر	۱۲۵/-
آدھے چاند کی رات	"	۷۵/-
ٹھکانہ	حیات اللہ انصاری	۶۰/-
خواب رو	جوگندر پال	۴۰/-
بے نام قاتل	یوگیش کمار	۶۰/-
ٹوٹتے بکھرتے لوگ	"	۶۰/-

Educational Publishing House
3108, AZIZUDDIN VAKIL STREET KUCHA PANDIT LAL KUAN DELHI - 6 (INDIA)